

ہفت روزہ

لاہور

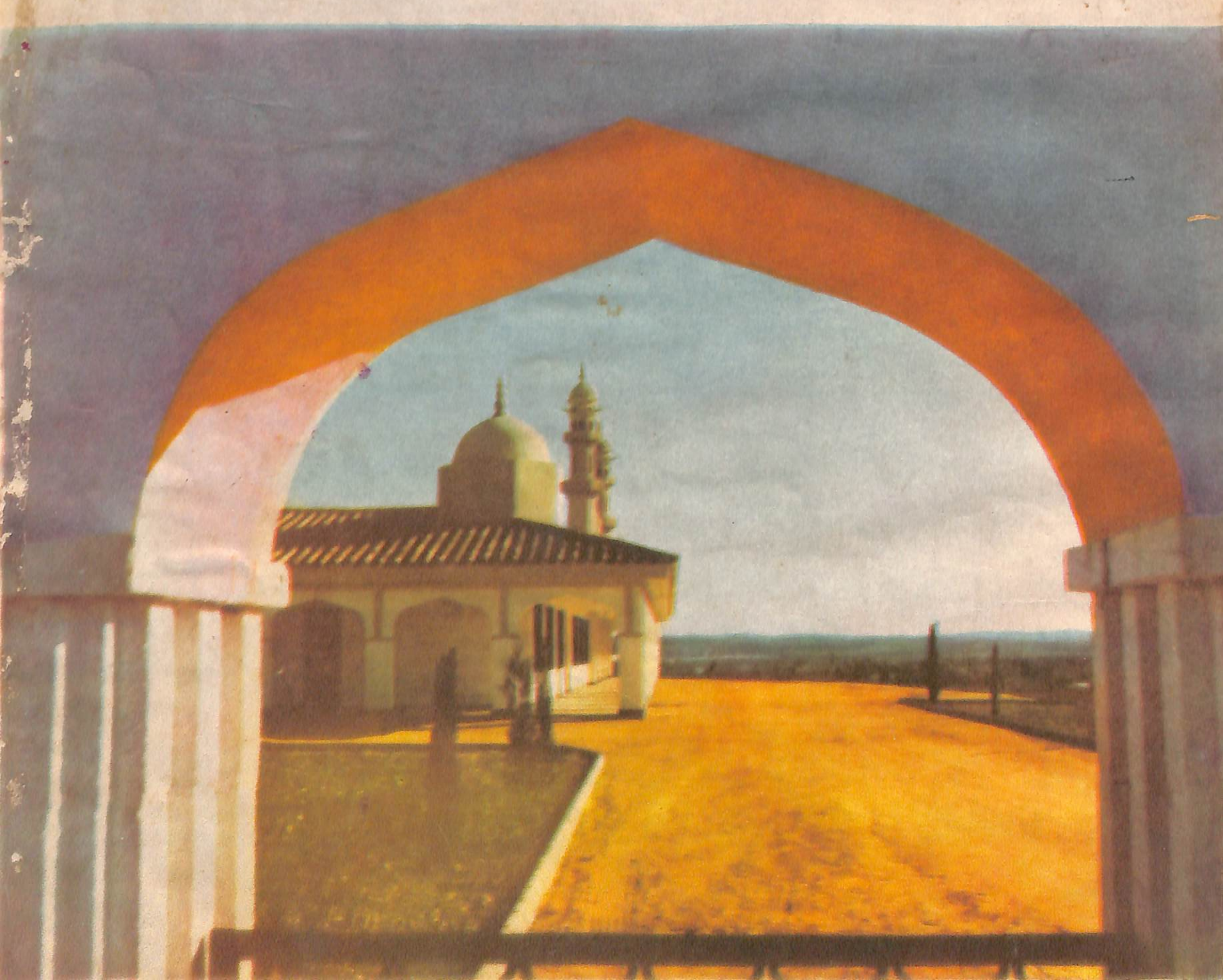
لاہور

ایڈیٹر: ثاقب زیروی

مسجد

"بشارت"

پیدرو آباد (اسپین)



نصیر ترلاس کے قلم سے

اسپین یا اُندلس

——— اپنی تاریخ کے آئینے میں

اوراق تاریخ کے بہ نظر غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کی حسین و جمیل وادیاں، زرخیز زمین، صحت بخش و خوشگوار آب و ہوا مختلف ادوار میں مختلف قوموں کے لئے باعثِ کشش رہی ہیں۔ یونانی آئے۔ تو یہ سرزمین "آئبیریا" کہلائی ——— رومنوں نے اس خطۂ ارض کو "ہسپانیہ" نام دیا ——— جرمن وانڈل نامی قوم نے جو یہاں ۴۱۱ء سے ۴۲۹ء تک حکمران رہی۔ اسے "وانڈلیسیہ" کہا۔ اور مسلمانوں نے اسے اُندلس کے نام سے موسوم کیا۔

مغربی مورخین کی تحقیق و تدقیق کے مطابق سب سے پہلی قوم جو اس ملک میں آباد ہوئی۔ وہ "کلٹ" تھی۔ پھر آئی۔ بیرتی اور لگورتی نامی قومیں آ آباد ہوئیں۔ اس کے بعد فنیقیوں نے قدم جمالئے۔ ۲۴۰ء قبل مسیح میں قرطاجنی جنوبی سپین پر حکمران ہو گئے۔ اور ملک کے مشرقی ساحل پر یونانیوں نے اپنی بستیاں تعمیر کریں ——— مختلف المزاج اور مختلف المزاج ان قوموں کے اجتماع نے باہم جنگ و جدال کو جنم دیا ——— بالآخر

رومیوں نے یہاں بالآخر تقریباً نصف صدی تک نہایت شان و شوکت سے حکمرانی کی۔

رومیوں کے بعد

رومی قانون کی حکمرانی کے قائل اور علم و فن کے قدردان تھے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق آئین و قوانین وضع کئے گئے۔ اور علم و فن کی اس درجہ حوصلہ افزائی ہوئی کہ اس دور میں سینیکا (فلسفی)، لوشیئس (مکالمہ نگار)، مارشل (شاعر)، اور ٹریجن (حکمران) ایسی مشہور ہستیاں پیدا ہوئیں تاریخ آج بھی جن کا عزت و احترام سے نام لینے پر مجبور ہے ——— لیکن افسوس کہ رومی زیادہ دیر تک اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔ اور اُن کی مملکت جلد ہی ملوک الطوائفی کی آماجگاہ بن گئی۔ اسی عرصہ میں ایک نئی قوم گاتھ نامی (جسے عربی مورخوں نے "زط" لکھا ہے) یونان۔ اٹلی اور فرانس سے ہوتی ہوئی ۴۱۴ء میں اسپین آ پہنچی۔ بعض مورخین کے نزدیک یہ وہی لوگ ہیں۔

جنہوں نے تیسری چوتھی صدی میں وسط ایشیا اور جنوبی یورپ کے ممالک کو لتاڑا۔ اور پھر تاخت و تاراج کرتی ہوئی ہندوستان تک پہنچی



جناب نصیر ترلاس اسپین کی ملاگا ایئرپورٹ پر اُتر رہے ہیں

اور یہاں اس کا نام جاٹ یا جٹ مشہور ہوا۔

وحشیانہ خصلتیں رکھنے کے باوجود جب اس قوم کی اسپین کے اکثر حصوں پر حکمرانی قائم ہو گئی۔ اور رومیوں کو ہر محاذ پر شکست ہو گئی۔ تو اس نے یہاں ایک باقاعدہ نظامِ حکومت قائم کیا۔ یہ پہلے بت پرست تھی۔ لیکن جب ان کا ایک بادشاہ عیسائی ہو گیا۔ تو ساری قوم ہی نے "عیسائیت" کو بطور مذہب قبول کر لیا۔ ویسے بھی اب تک اس سرزمین میں جہاں تہاں "عیسائیت" کافی پھیل چکی تھی۔

پادریوں کی جاہ پرستی

گاتھ قوم نے زراعت پر خصوصی توجہ دی اُن کے عہد میں یہ ملک جلد ہی تمدنی اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے اوج کمال پر پہنچ گیا۔ گاتھک طرز تعمیر کی مقبولیت تو آج بھی مسلم ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ایک "شاہی کونسل" رچنے ... بھی کہا جاتا تھا قائم کی ... پادریوں کو بطور ... شریک کیا اور تاریخ کے اوراق ... گواہی دیتے ہیں کہ

... پادریوں ... حکومت ... جس

... اس کے ... کا حصہ

... ہوا

... پادری ... اقتدار ... رفتہ

اس قدر مضبوط کر لی۔ کہ بادشاہ اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ چند ایک جنہوں نے اُن کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوشش کی۔ اُنہیں انجام کار تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ پادری اقتدار کے ہر شعبہ پر اس قدر حاوی تھے کہ

وہ باقاعدہ "جنت" کے پروانے جاری کرتے تھے۔ سنگین ترین جرائم کے مرتکب۔ مجرموں کو "معافی" دینے کا رواج بھی ان پادریوں ہی کے ہاتھوں ہوا۔

یہاں تک کہ اُن کے فتووں کے سبب ——

"یہودیوں" سے حقوقِ وطنیت چھین لئے گئے۔ بیشتر یہودی یا تو زندہ جلا دیئے گئے۔ یا قتل کر دیئے گئے کچھ جلا وطن کر دیئے گئے۔ مگر جو بچ رہے۔ اُن کی درپردہ سازشوں کے سامنے حکومت زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ اوّل اوّل اُنھوں نے حکومت کے شعبۂ مالیات پر قبضہ حاصل کیا۔ اور اس کے بعد بیش بہا تحفوں۔ نذرانوں اور رشوتوں سے عیسائی پادریوں کو خرید کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔

راڈرک کا تسلط

رشوت خور پادریوں اور بادشاہوں کی بے بسی نے معاشرہ میں تعیش اور عشرت پسندی کے جراثیم پھیلائے۔ پادری۔ بادشہ۔ اُمراء اور جاگیردار سب عیش پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ عوام سے ملازموں سے بھی بدتر سلوک ہونے لگا۔ جس کے نتیجہ میں جہاں تہاں بغاوت کی چنگاریاں سُلگ اُٹھیں (تاریخ اندلس ندوی۔ ص ۵۵۔۵۶۔۵۷)

اس قوم کا آخری حکمران "دی ٹی زا" نامی تھا۔ جس نے عوام سے مقبولیت حاصل کرنے کے لئے رفاہِ عامہ کے کاموں کی طرف توجہ کی۔ اُس نے جُوں تُوں یہودیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ لیکن جاہ پرست پادریوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اور بالآخر اُسے بھی تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اور زمامِ حکومت "دی ٹی زا" کے ایک غیر مُلکی سپہ سالار راڈرک نے سنبھال لی۔

راڈرک کے ایک گورنر کاؤنٹ جولین کی صاحبزادی (فلورنڈا نامی) شاہی محل سرا میں تعلیم و تربیت کے حصول کے لئے آئی ہوئی تھی۔ راڈرک اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور ایک دن بالجبر اُس کی عصمت لُوٹ لی۔ اس جرمِ عظیم کی خبر کاؤنٹ کے کانوں تک پہنچی۔ تو اُس کے تن بدن میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی اور اُس نے شمالی افریقہ کے مسلمان حکمران مُوسیٰ بن نصیر کو عوام کی مظلومیت کی الحالی۔ حکومت پر بے اعتمادی نیز پادریوں اور بادشہ کی عیش پرستیوں کی ساری تفاصیل لکھ کر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

طارق کا ورُود

ایک عیسائی کاؤنٹ۔ ایک عیسائی حکومت پر ایک مسلمان حکمران کو حملہ آور و قابض ہونے کی دعوت دے۔ یہ ایسی بات نہ تھی۔ کہ مُوسیٰ بن نصیر اُسے منظور کر لیتا۔ اس لئے اُس نے

- سب سے پہلے کاؤنٹ جولین ہی سے ایک چھوٹا سا حملہ کرا کے اُس کی درستی کے خلوص کو پرکھا۔
- اس کے بعد طریف کی سربراہی میں ایک مختصر سا دستہ حربی آزمائشوں کے لئے بھیجا۔ جو کامگار لوٹا۔ اور پھر
- اپنے ایک آزاد کردہ غلام طارق ابنِ زیاد کو بربری نسل کے سات ہزار شہ زور جوانوں کی فوج دے کر اسپین پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔

طارق اپنی نوعیت کا ایک ہی شجاع تھا۔ اُس نے سرزمینِ اسپین پر اُترتے ہی اپنے ساتھیوں کو کشتیاں جلا دینے کا حکم دیا۔ اور جب یہ کشتیاں جل گئیں تو اُن سے کہا

"اب تمہارے سامنے دشمن ہے اور پیچھے سمندر۔ فرار کی کوئی راہ نہیں۔ اب فلاح اسی میں ہے کہ تلواریں سُونت کر دشمن پر پل پڑو۔ اور تکلیفوں سے لدی پھندی اس سرسبز و شاداب سرزمین پر قبضہ کر لو۔"

ہسپانوی نظامِ حکومت۔ پادریوں اور جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں اور عیش پرستیوں سے پہلے ہی نالاں تھے اور اُن کے دلوں میں ایک عرصہ سے بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس لئے طارق اور اُس کے ساتھیوں نے جس طرف بھی رُخ کیا۔ فتحیابی و کامرانی نے بڑھ کر اُن کے قدم چومے۔ یہ مسلمان فوجی اتنے قد آور۔ ایسے نڈر۔ اس قدر جری اور عظیم الجثہ تھے۔ کہ اُن کی شکل و شباہت۔ ڈیل ڈول اور حربی جسارتوں نے اہلِ سپین کو واہموں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ (بحوالہ تاریخ اندلس و مُورز اِن سپین) تدمیر کے گورنر نے راڈرک کو ان مسلمان لشکریوں کے متعلق ان الفاظ میں اطلاع دی

"ہماری زمین پر ایک قوم اُتر پڑی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ آسمان سے نازل ہوئی ہے یا زمین سے نکل پڑی ہے۔"

مسلم حکومت کا قیام

راڈرک جو (اُس وقت) مقامی بغاوتوں کو فرو کرنے میں معروف تھا۔ طارق کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے خود میدانِ مبارزت میں اُترا۔ لیکن اُس کے جاہ و جلال کے دن پُورے ہو چکے تھے شکستِ فاش سے ہمکنار ہُوا۔ اور اسی طرح

(باقی ۳۱ پر)

ایک اَور مسجد

"— افتتاحی تقریب کے لئے میری طرف سے وہی پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے مساجد کے بارے میں فرمایا ہے۔ اِنَّ المساجد لِلّٰہ فلا تدعوا مع اللہ احدا یعنی مساجد خالصتاً اللہ کی عبادت اور اُس کی پرستش اور اُس کے ذکر کے لئے مخصوص ہیں۔ مساجد کی آبادی اور خوبصورتی اور اُن کا حُسن خلوصِ قلب سے اُن میں ذکرِ الٰہی اور عبادت کرنے میں ہے۔ وہی مسجد خُدا کے حضور مقبول ہے۔ جو تقویٰ کی بنا اور تقویٰ کی دیواروں پر اُستوار کی گئی ہے۔"

یہ ہے وہ پیغام جو امام جماعت احمدیہ حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے سیرالیون کے مرکزی شہر بو میں تعمیر ہونے والی ایک نئی رفیع الشان مسجد کے افتتاح کے موقع پر امیر جماعت مقامی کے نام بھجوایا جس کی افتتاحی تقریب میں معززین شہر چیف ڈم کے اسپیکر۔ اعلیٰ حکام۔ تاجر اور علمی و مذہبی اکابر کے علاوہ حکومت کے تین وزراء نے بھی شرکت کی۔

واضح رہے۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد جماعت کے تیسرے امام حضرت صاحبزادہ میرزا ناصر احمد نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے تبلیغی و تربیتی دورۂ افریقہ کے دوران رکھا تھا جس کا افتتاح ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ یہ مسجد جس کا نام "مسجد ناصر" ہے ۸۰ ہزار لیون (یعنی ۸ لاکھ پاکستانی) کے خرچ سے تعمیر ہوئی ہے۔

(وقائع نگار خصوصی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بعد از خدا بعشقِ محمد مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ہفتہ وار لاہور لاہور

خصوصی اشاعت

ایڈیٹر ثاقب زیروی۔ قیمت فی پرچہ پانچ روپے

جلد ۳۱ | ۱۲/۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ء | نمبر ۵۰/۵۱

اطمینان بخش پہلو

تہذیب و سیاستِ مغرب کے بطن اتنے زیادہ ہیں، کہ ایک غائر و متجسس نظر اور ایک غوّاص و نکتہ رس دماغ کو بھی ان کی حقیقت اور رموز و اسرار سے آگہی کے لئے برسوں کے ریاض کی ضرورت ہے۔ اِسی لئے آج تک جن قوموں اور ملکوں نے بھی ان کے دلی جذبات اور خلوصِ نیت کا اندازہ ان کے گرمجوش خیر مقدموں اور خوش آئند استقبالیوں کے اہتمام و انصرام کی چکا چوند سے کرنے کی کوشش کی، اُن کی جانچ پرکھ ہمیشہ ناکام و ناکمل رہی۔ اس پر مستزاد ان رسمی و سرکاری تقریبات میں کی جانے والی وہ دلفریب تقریریں ہیں، جن کے فقرات کی بندش ایسی چست اور دلآویز ہوتی ہے۔ اور جن کے ہر لفظ میں ایسی سیاسی شناس اور اظہار و بیان میں ایسی شستگی ہوتی ہے کہ اُنہیں سُن کر ایک دفعہ تو بڑے بڑے راسخ الفکر چکر کھا جاتے ہیں۔ ان تقریروں کا ایک حسن یہ ہوتا ہے۔ کہ

الفاظ و فقرات میں تبدیلی ہو تو ہو معنی و مفہوم کے اعتبار سے قریباً سب ہی یکساں ہوتی ہیں۔

آپ سنہ ۱۹۸۲ء میں امریکہ کا سرکاری دورہ کرنے والے بیرونی سربراہوں کے اعزاز میں کی جانے والی تمام تقاریر کو ایک ساتھ رکھ کر مطالعہ کر دیکھئے کیا مجال جو معنی و مفہوم کے اعتبار سے اُن میں ذرا بھی فرق نظر آ جائے۔ سوائے وزیر اعظم بیگن کے دورۂ امریکہ کے وقت کی جانے والی تقریر کے۔ اور کون نہیں جانتا کہ امریکہ کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات ساری دُنیا سے ڈھکے چھپے ہیں گہرے بھی۔ شاید اسی باعث ہم نے مغربی مُلکوں کے تمکنت آفریں خیر مقدموں اور سرکاری خیر مقدمی تقاریب میں کی جانے والی دلآویز تقریروں سے اُن کے خلوصِ نیت کی گہرائی و گیرائی کو ناپنے کا شغل ترک کر دیا ہے۔

امریکہ اہلِ پاکستان کے لئے کوئی نیا مُلک نہیں۔ ان دونوں مُلکوں کا سیاسی ساجھا بھی بڑا پُرانا ہے۔ امریکہ اُس وقت سے ہی ہماری بقاء و سالمیت کا محافظ بنا ہُوا ہے۔ جب پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے اِس کا دَورہ کیا تھا۔ جس کے بعد ہمارا اُس سے باقاعدہ "دفاعی معاہدہ" بھی ہُوا۔ یہ اَور بات ہے کہ سنہ ۶۵ء کی جنگِ پاک و بھارت میں اُس نے جس طرح اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنایا۔ اور اُس کے بعد پاکستان کا سرپرست قسم کا حلیف ہونے کا دعویدار ہونے کے باوجود سنہ ۷۱ء میں جو رول اُس نے وطنِ عزیز کی سالمیت کو دو لخت کرنے کے سلسلہ میں ادا کیا۔ اہلِ پاکستان کے دِلوں پر اُن کے نقوش چنداں خوشگوار و حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ اور نہ ہی اسی سے آج تک اُن کی کوئی اطمینان بخش تاویل ہی مِل پائی ہے ـــــ اس وقت پاکستان کی طرف اُس کے محبانہ و سرپرستانہ جُھکاؤ کی سب سے بڑی وجہ قضیۂ افغانستان ہے۔ جس کا اوّل و آخر انعام یا خمیازہ بھی ہمیں ہی وصول کرنا ہے۔ باقی تمام مُلکوں خصوصاً مغربی مُلکوں کی حیثیت فقط ساحل ہی سے رزم خیر و شر کا مشاہدہ کرنے کی ہے۔ اس قضیہ کے نتیجہ میں ہمارا اپنی ایک ایسی ہمسایہ اسلامی مملکت سے اچھا خاصہ بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔ جس کی پُشت پر رُوس ایسی سُپر طاقت ہے۔ جس سے ہمارا کوئی مقابلہ نہیں۔ اور جس کی مسلح فوجیں افغانستان میں داخل ہو جانے کے باعث ہماری سرحدوں تک پہنچ چکی ہیں۔ امریکہ اور اُس کے مغربی اتحادیوں کو اس مسئلہ سے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں کہ اُن کے ہاتھ ایک ایسا مسئلہ آ گیا ہے کہ

وُہ جب چاہیں۔ اپنے سب سے بڑے حریف (رُوس) کو ہر بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بڑے دھڑلے سے نشانۂ طعن و تنقید بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے اگر انہیں پاکستان میں داخل ہونے والے تین ۳ لاکھ کے لگ بھگ پناہ گزینوں کی امداد کے لئے ہر سال چند لاکھ ڈالر صَرف بھی کرنے پڑیں۔ تو یہ سَودا مہنگا نہیں ـــــ پناہ گزینوں کا اصل بوجھ تو بہر حال پاکستانی معیشت ہی پر ہے۔

اس لئے ہمارے نزدیک صدرِ پاکستان کے دورۂ امریکہ کے اثرات و نتائج پر تبصرہ کرنے کا اصل وقت وُہ ہو گا ـــــ جب یہودی و بھارتی لابی کے زیر اثر کانگرس اور سینٹ کے ذی وجاہت حلقوں کا ردِّ عمل منظرِ عام پر آ جائے گا۔ اس کے لئے صرف خیر مقدمی تقاریب کی ہماہمی اور چکا چوند ـــــ اور اُن میں کی جانے والی تقریروں کی سیاسی دلآویزی کافی نہیں اس لئے بھی کہ

ان قوموں کا تو طریقِ کار ہی یہ ہے کہ۔ ع
لاتی ہیں سُرورِ اوّل دیتی ہیں شراب آخر

اِس وقت ہمارے نزدیک صدر ضیاءؔ کے دَورۂ امریکہ کا سب سے اطمینان بخش پہلُو یہ ہے کہ اُنہوں نے آج کی سب سے بڑی طاقت کے گھر میں جا کر اور اُس کے سب سے با اختیار فرد سے مِل کر پاکستان کے مؤقف کے بے کم و کاست اظہار میں کسی قِسم کا کوئی تذبذب محسُوس نہیں کیا۔ بلکہ بڑے واضح الفاظ میں یہ بتلانے میں فخر محسُوس کیا۔ کہ پاکستان غیر جانبداری کے اصُولوں پر قائم ہے۔ اور اسلامی کانفرنس کے اصُول اُس کی خارجہ پالیسی کی بُنیاد ہیں ـــــ بلکہ جیسا کہ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی خبروں سے واضح ہے۔ اُنہوں نے تو غیر رسمی اور غیر سرکاری مجالس میں وطنِ عزیز کے داخلی امور کے بارے میں کسی قسم کی لگی لپٹی رکھنے کی ضرورت بھی محسُوس نہیں کی۔ جیسا کہ (بحوالہ "جنگ" لاہور ۸ر دسمبر سنہ ۸۲ء) ـــــ اُنہوں نے واشنگٹن اور اُس کے مضافات میں آباد پاکستانیوں کی ایک استقبالیہ تقریب میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہُوئے واشگاف انداز میں کہا کہ

قوم کے اعتماد کے لئے انہیں انتخابات کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انتخابات ہم اُسی وقت کرائیں گے جب ہم اقتدار قوم کے نمائندوں کے حوالے کرنے میں بہتری محسُوس کریں گے۔ اُس وقت ریفرنڈم بھی ہو گا۔ الیکشن بھی ہو گا اور لوگوں سے اُن کی رائے بھی پُوچھی جائے گی۔

جس کے بعد اپنے مُلک کے نام نہاد سیاسی زعماء کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اب وہ آئے دن مضحکہ خیز بیانات سے عوام کو اُلّو بنانے کا دھندا چھوڑ کر پیر پگاڑا کی مسلم لیگ اور کالعدم جماعت اسلامی کی طرح اپنی ساری کوششیں مارشل لاء کے تحت وزارتوں ہی کے حصُول پر مرتکز کر دیں ـــــ ع
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

صُورتِ حال

ہیں جن گورے مُلکوں کے قرضوں کی مَد سے
ان اہلِ سیاست کے روشن منارے
اُنہی اہلِ مغرب کی اُترن پہن کر
غریبوں کے بھی ہو رہے ہیں گزارے

(شاعرِ "لاہور")

آل احمد سرور

سستی شہرت کسی کو مل بھی جائے۔ تو دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ اور ادب کی دُنیا میں خدا کی کائنات کی طرح دیر تو ہو سکتی ہے۔ اندھیر نہیں۔ ہر شخص کو اُس کا حق جلد یا بدیر ضرور مِلتا ہے۔

ادب اور ادیب

آزادی کے بعد جو واقعات پیش آئے اُن سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا متاثر ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ

خیالی پُلاؤ کی بجائے
اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن
کی بھرمار شروع ہوگئی۔

تقسیم نے دِلوں کو جس طرح مجروح کیا تھا۔ اُس کے نتیجے میں دلوں کی جراحتوں کے چمن کھلائے گئے۔ فسادات کا بیان۔ اُن کا تجزیہ ——— اصلی مجرم کی تلاش ——— دِلوں کے چھید دریافت کرنے کی کوشش ——— خوابوں کے آبگینوں کی شکست اور حقائق کی سنگینی کا ہیبت ناک احساس عام ہُوا ——— بارے جو آگ بھڑک رہی تھی۔ وُہ بجھنی شروع ہوئی۔ ریاسی دستاویزیں۔ صحافتی میلے کم ہوئے۔ تجربے کی گہرائی اور گیرائی۔ تخیّل کی کارفرمائی۔ حسن کاری کے احساس کا مطالبہ شروع ہُوا۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ

اب شاعر اور ادیب
سے زندگی کی عکاسی کا مطالبہ
ہے۔ فوٹوگرافی کا مطالبہ
نہیں۔

رنگوں اور خطوط کی اُس جنّت کا مطالبہ ہے۔ جو شاعر اور ادیب کی بصیرت۔ تجربے۔ نظر اور جمالیاتی احساس کی ترجمان ہوتی ہے۔

بصیرت کے طفیل

شاعر اور ادیب کی یہ بصیرت ہمیں کیا دے سکتی ہے اور کیا نہیں ——— یہ ہمارے ہاتھ میں تلوار نہیں دے سکتی ——— ہاں ذہنی تلوار دے سکتی ہے۔ ہمارا شاعر اور ادیب اَدب کی خاطر کسی خیالی دُنیا میں پناہ نہیں لے سکتا۔ نہ وُہ اس مقدّس کام کے بہانے روزمرہ زندگی کے تقاضوں سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اُسے تند جبیں ہونے کا حق نہیں۔ ادیب اور شاعر سماج کی چوٹی پر کھڑے ہو کر مزدوروں اور کلرکوں کو حقارت سے نہیں دیکھ سکتا۔ وُہ ... نی میں سے ہے۔ ہاں اُس کا کام اُن سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی سب کا کام ہے۔

وُہ دیدۂ بینائے قوم
ہے۔ مگر اُس کے لئے صرف
اشکوں کے دریا بہاتے رہنا
کافی نہیں۔ اُسے اپنی آنکھوں
سے بدلتے ہوئے معاشرے
کو دیکھنا ہے۔

اس نے تہذیبی معاشرتی اور سیاسی کش مکش میں حصّہ لیا ہے۔ جو ہماری بساط پر ہو رہی ہے۔ وُہ کبھی پابند ہے۔ مگر اُس کی پابندی دُوسروں سے زیادہ ہے۔ وہ سماجی رشتوں کے علاوہ فن کے تقاضوں کا بھی پابند ہے۔ یہ فن جامد نہیں۔ ترقی پذیر ہے۔ مگر اس میں تسلسل کا احساس ضروری ہے۔ حال کی بھول بھلیوں میں راستہ ماضی کے عرفان کا بھی ملتا ہے۔

ہمارے ادب میں سیاسی رشتوں کا احساس تو عام ہے۔ مگر اُن کی نوعیت کا احساس واضح نہیں۔ ادیب اور شاعر کی وُہ آزادی جو انسانیت کے ایک جامع تصوّر کے ساتھ ہے۔ جو ادب کو نہ محض سیاست کا کھلونا بنا لینے پر قانع ہے نہ مذہبی احکام کی شرح۔ ایسی آزادی ہے جس کے لئے ہمیں اصرار کرنا چاہیئے۔

ادیب اور شاعر اگر اپنی تاریخ
اپنی تہذیب اور انسانیت کی
اعلیٰ قدروں کا احساس
رکھتے ہیں۔ تو اُنہیں حق ہے
کہ اپنے سماج اور حکومت پر
نقطہ چینی کریں۔ اسی کی اہمیں
آزادی ہونی چاہیئے۔

ادیب کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وُہ لکیر کا فقیر نہ ہو۔ اور نہ فضا میں آکر بے لگام ہو جائے وُہ صنعتی زندگی کا احساس رکھتے ہُوئے مشین کا دشمن نہ بن جائے۔ مشین احساس پر جو اثر ڈالتی ہے۔ ذہن کو پرواز سے جس طرح روکتی ہے سستی یکسانیت اور رادبی تفریح کی طرف جس طرح میلان پیدا کرتی ہے۔ اُسے سمجھتے ہُوئے اُس کی دی ہوئی برکتوں سے انکار نہ کرے۔ مشین کی غلامی کی بجائے مشین پر قابُو رکھے۔

فلم اور ریڈیو کی حد بندیوں
کو سمجھے اور اُس کی مرّوجہ قدروں
کا پابند نہ ہو۔ بلکہ اُنہیں قدریں
دے سکے۔

سرد عقلیت سے کام لینے کی بجائے پُرسوز شخصیت کا اثر ڈالے۔ اُردو ادب نہ صرف اپنی دُنیا کی بلکہ پُورے بین المملکتی ادیبوں کی ذہنی قیادت کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وُہ ادب صرف لکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ پڑھنے والوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہُوئے بھی پیش کرے۔ لکھنا اور پڑھنا دونوں ایک باشعور ترجمانی کے دو جُز ہیں۔ کیا ہم اس باشعور ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں یا صرف حالات کے غلام ہیں؟ اور جو گزرتی ہے اُسے بیان کرنے پر قانع ہیں۔ کیا ہم پڑھنے والوں کے مذاق کے ترجمان ہیں یا اُن کی ضروریات کو سمجھتے ہُوئے اُن کے ذہن کو آسودگی۔ اُن کے خیالات کو وسعت اور اُن کے جذبات کو حرارت دے سکتے ہیں؟

لِکھنا کیوں؟

یہ سوال بارہا کیا گیا ہے۔ اور اِسی کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ مَیں اپنی آسودگی کے لئے لکھتا ہُوں ——— کوئی سماج کی ذہنی قیادت کے لئے قلم ہاتھ میں لیتا ہے۔ کوئی اس لئے لکھتا ہے۔ کہ اُسے لکھنے میں لُطف آتا ہے۔ کوئی بقول ڈاکٹر جانسن پیسوں کے لئے لکھتا ہے۔

یہ سب جواب علیحدہ علیحدہ
صحیح ہوتے ہوئے بھی پُوری
حقیقت کو بیان نہیں کرتے۔
احساس اظہار پہ اور اظہار

ترجمانی پر مجبور ہوتا ہے۔ جتنا ہی باشعور اور بھرپور احساس ہوگا۔ اتنا ہی اظہار میں سلیقہ ہوگا۔ اور اظہار میں سلیقہ کے بغیر ترجمانی یا ترسیل ممکن نہیں ہوتی جن لکھنے والوں کا احساس مَن کی موج سے آگے نہیں بڑھتا اُن کے اظہار میں بھی وُہ مدّوجزر ہوگا۔ اور اس اظہار کے اعلان میں پیچ وخم آجائیں گے۔ جو لوگ صرف پیسے کمانے کے لئے لکھتے ہیں۔ خواہ وُہ اخبار کے لئے لکھیں یا کسی ادارے کے لئے یا فلم کے لئے۔ وُہ حالات کے غلام ہو جاتے ہیں۔

اُن کی حیثیت اُن ہُنرمندوں کی سی ہے۔ جنہیں اپنے ہُنر کو بازار کی ضرورت کے سانچوں میں ڈھالنا ہے اور بس لیکن مہذّب اِنسان بازار کی ضرورت کے سہارے پر نہیں جیتا۔ وہ ان تہذیبی قدروں کی خاطر جو اُسے عزیز ہیں۔ اور جو انسانیت کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ اپنے قلم سے ایک جہاد کرتا ہے۔ اُس جہاد میں اُسے صرف اپنی بات کہہ کر سُبکدوش ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہے۔ دوسروں کے مَیلان کو دیکھتے ہوئے اپنی بات اس طرح کہنی ہے۔ کہ وُہ رائیگاں نہ جائے۔

محض خشک وعظ پند نہ ہو جائے
صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو۔ بلکہ
دِل سے نِکل کر دلوں میں بیٹھ
جائے۔

نا تسلّی بخش انفرادیت

اس لئے لِکھنے والوں کو اس انفرادیت سے بچنا چاہیئے۔ جو یا تو رُومانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یا مریض اشاریت کی طرف یا مزاج کی جانب، اچھا لکھنے والا اپنے حلقہ سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس پر قناعت کرسکتا ہے کہ چند مخصوص اور اہلِ نظر حضرات ہی اس کی بات سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بات تہہ دار ہو۔ اس کے کچھ پہلو سب پر واضح ہو جائیں لیکن کچھ پہلو صرف خواص کے لئے ہوں۔ یہ بات کسی طرح بُری نہیں۔ مگر اسے بحیثیتِ مجموعی زیادہ سے زیادہ ترسیل یا ابلاغ کی کوشش کرنا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اُس کی بات میں وزن اور احساس کے اظہار میں سلیقہ ہو۔ لوگ اُس کے خیال کو سمجھ سکیں۔ اور اُن سے اثر لے سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

علمیّت کے نامناسب اظہار
اصطلاحات کی بھرمار۔ اور ترجمے
کی سی اُکھڑی اُکھڑی عبارت
سے پرہیز کیا جائے۔

ہماری تحریر میں ہماری زبان کی خصوصیات جلوہ گر ہوں۔ وہ کسی دوسری زبان کی بھونڈی نقّالی ہو کر نہ رہ جائے۔ نئی نسل اپنے ادبی سرمائے سے پُوری طرح واقف نہیں ہے وُہ اسالیب کے اظہار کو نہیں جانتی۔ اُسے اپنے الفاظ کے ذخیرے سے پُوری طرح کام لینا نہیں آتا۔ اس وجہ سے ایسی تحریر اُن پر اثر نہیں کرتی۔ ذہن میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ گہرا تاثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اور انبساطِ ذہنی نہیں دے سکتی۔ جو اچھے ادب کا انعام ہے۔

ادبیت کے تقاضے

ہمارا ادب ایک طرف صحافتی اور کاروباری ہو رہا ہے۔ جس کے رد کرنے کے لئے فکر و فن کے آداب برتنے ہیں۔ دوسری طرف اس میں تفریحی ادب کی وُہ آمیزش ہونے لگی ہے۔ جو اپنے ساتھ بڑے بڑے خطرے لائی ہے۔ فلم اور ریڈیو سے کوئی آج مُنہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ نہ صرف ان پر طنز کر کے اپنی تسلیات کا سامان کر سکتا ہے۔ اُسے یہ تو ملحوظ رکھنا ہے۔ کہ فلم اور ریڈیو کے آداب ادب میں اس طرح راہ نہ پائیں کہ ادبیت کے تقاضے آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں۔

ریڈیو بھی فنّی اظہار کا ذریعہ ہے۔ اور فلم بھی۔ مگر ایک میں سرکاری مصلحتوں کی پابندی ہے، اور دُوسرے کے اعصاب پر اقبال کے الفاظ میں، عورت سوار ہے۔ اس لئے ریڈیو اور فلم کے مُضر اثرات سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اور ان وسائل کی وجہ سے فکر میں جو سستا اور کاروباری مَیلان پرورش پا رہا ہے۔ اُس پر کڑی نظر رکھنا لازمی ہے

غزل

صبحِ کاذب ہے کوئی ہل کے صدا دی جائے
یہ سیہ دھند کی دیوار گرا دی جائے

لوگ اربابِ عزائم کا اڑاتے ہیں مذاق
ہم پہ جو بیت گئی، کس کو بتا دی جائے

نغمہ وُ نَے سے اُبھاریں کوئی تصویرِ جنوں
جس میں شعلوں کی لپک ہو وہ صدا دی جائے

راستے قافلے والوں کی نظر میں ہیں تمام
دھول کو لاکھ بگولوں سے ہوا دی جائے

رازِ غم مجلسِ احباب کی تفریح نہیں
آئینہ خانے میں کیوں شمع جلا دی جائے

شکریہ تو مری فطرت ہے مگر سائے تو ہوں
دشت سے دھوپ کی جاجم تو اُٹھا دی جائے

میرے سجدوں میں ریا ہو تو جہنّم منظور
پہلے دُوری کی شکایت تو مٹا دی جائے

انقلابات ہیں خود اپنے اصولوں کا جواز
اب کے آئین میں یہ شِق بھی بڑھا دی جائے

جس کا مدّت سے ہے شیشے کے مکانوں میں رواج
ہم پہ اس عشق کی تہمت نہ لگا دی جائے

دار و زنداں کا تو اِک شور بپا ہے لیکن
کوئی جینے کی تو تدبیر بتا دی جائے

اِک مصوّر نے جو سونپی تھی امانت کی طرح
یہ بھی ممکن ہے وہ تصویر مٹا دی جائے

فرض ہے اُس پہ محمّد کی غلامی دانشؔ
جس کی تحویل میں مخلوقِ خدا دی جائے

احسانؔ دانش

عمومی اپیل

ہمارے نئے ادب میں اب عمومی اپیل کم ہو رہی ہے۔ وہ ٹولیوں یا پارٹیوں کو زیادہ ملحوظ رکھتا ہے۔ تخلیق سے زیادہ تنقید پر زور ہے اور تنقید کے معنے کسی مخصوص نظریہ کی اشاعت یا کسی پسندیدہ شاعر یا ادیب کی ستائش کے ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے ادیب ابھی تک اس مرض میں زیادہ گرفتار نہیں ہیں۔ مگر یہ مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس گرم رفتاری کی وجہ سے ادب کی بساط ایک اکھاڑہ بن جائے۔ تنقید پر توجّہ اچھی چیز ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب زندگی اور ادب میں بڑی پیچیدگی آگئی ہے۔ تنقید کے ذریعہ صحتِ ذہنی کے معیار قائم رکھنا ضروری ہیں۔ مگر تخلیق پر مناسب توجّہ کے بغیر ہماری مثال اُس سائیس کی ہو جائے گی۔ جو مالش کا عادی تھا۔ خواہ گھوڑا ہو نہ ہو۔

نئے ادیبوں کو خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ اچھا ادب صرف زندگی کی بصیرت اور قدیم و جدید اسالیب کے علم سے وجود میں آتا ہے سستی شہرت کسی کو بھی مل جائے۔ تو دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ اور ادب کی دنیا میں خدا کی کائنات کی طرح دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ ہر شخص کو اس کا حق جلد یا بدیر ضرور ملتا ہے ——
لیکن اچھا ادب خود ایک نعمت ہے۔ جو شہرت۔ عزّت اور دولت کا محتاج نہیں۔ ہاں —— یہ چیزیں بالآخر اُس کے قدم چومتی ہیں ؎

○

چار حرف

ایک دفعہ مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کی محفل میں ایک شخص آیا۔ اور انہیں ایک کتاب پیش کی۔ جس کا نام تھا

"آریہ دھرم پرچار"

مولانا نے اُسے دیکھتے ہی قلم اٹھایا اور لفظ "چار" کے آگے "حرف" کا لفظ بڑھا کر کتاب لانے والے کو واپس کر دی۔ اب جملہ بن گیا

"آریہ دھرم پر چار حرف"

اور محفل اسے دیکھتے ہی کشتِ زعفران بن گئی۔

انتقاد

سید نور الحسن ہاشمی
ڈائرکٹر اطلاعات و تعلقاتِ عامہ پاکستان (ریٹائرڈ) لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم
وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

تحدیثِ نعمت

خاکساریم و سخن از رہِ غربت گوئیم
یعلم اللہ کہ بہ کس نیست غبارے مارا

محمد ظفر اللہ خاں

مصنّف —— محمد ظفر اللہ خاں

"—— اٹلی نے اپنے تیس ۳۰ سالہ اقتدار کے زمانہ میں لبیا کی عرب آبادی کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک روا رکھا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اٹلی کے لئے ترکی افواج کو لبیا میں پسپا کر دینا تو کچھ دشوار ثابت نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد ملک کی عرب آبادی کو زیرِ اقتدار لانے میں اٹلی کو بہت مشکل کا سامنا ہوا۔ اٹلی کی طرف سے اس مہم کو سَر کرنے کی ساری ذمہ داری مارشل بڈو گلیو پر ڈالی گئی۔ انہوں نے "قیامِ امن" (PACIFICATION) کی پالیسی کی سرانجام دہی میں نہایت درجہ وحشت اور بربریت کے طریق اختیار کئے۔ مثلاً ایسے شیوخ —— یا قائدین جو کسی قیمت پر اطالوی اقتدار کے سامنے سرِ خم کرنے پر رضامند نہ ہوتے انہیں جبراً ہوائی جہاز میں کئی ہزار فٹ کی بلندی پر لے جا کر جہاز سے نیچے گرا دیا جاتا۔ یا کوئی ریگستانی آبادی اقتدار کا جُوا اپنی گردن اٹھانے سے انکار کرتی —— تو مارشل بڈو گلیو کا توپ خانہ آبادی کے گرد گھیرا ڈال دیتا۔ اور آبادی کے پانی کے ذخیروں میں بھاری مقدار میں زہر ڈال دیا جاتا۔ محصور آبادی میں سے جو باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔ وہ اطالوی توپ خانہ یا بندوق کا نشانہ بنتے۔ اور جو باہر نکلنے کی کوشش نہ کرتے۔ وہ پیاس یا زہر آلود پانی پینے سے تڑپتے ہوئے جان دے دیتے۔"

یہ اقتباس ہے۔ محترم قبلہ چودھری محمد ظفر اللہ خان کی خودنوشت سوانح —— "تحدیثِ نعمت" کی طبعِ ثانی سے۔ جو حال ہی میں نظر سے گزری ہے۔

پاکستان میں یا بیرونِ پاکستان آپ کسی ایسے شخص سے ملیں۔ جو اپنے ملک میں کسی یورپی قوم کی حکمرانی دیکھ چکا ہو۔ تو وہ درجِ بالا قسم کے وحشیانہ سلوک و تجربات کی کئی مثالیں سنائے گا۔ اطالوی، پرتگیزی اور ولندیزی نوخصوصاً اپنی نوآبادیوں میں بے شمار خونیں داستانیں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ سچے واقعات آپ کو اُن نوآبادیوں کے مشاہیر کی سوانح میں ملیں گے۔ خواہ یہ سوانح خودنوشت ہوں یا واقفانِ رازہائے پوشیدہ کے قلم سے نکلے ہوئے ہوں۔ اور یہ بات تو دُنیا بھر کے طالبِ علم مانتے ہیں۔ کہ مستند تاریخ وہی ہے۔ جو ان سوانح۔ ذاتی روزناموں یا سفرناموں پر مبنی ہوتی ہے۔ روائتی انداز میں لکھی ہوئی تاریخ ہزار تحقیق و خورد بینی پر مبنی ہو۔ تشکیک و قیاس سے مبرّا نہیں ہوتی —— قبلہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے آج سے دس گیارہ برس قبل —— "تحدیثِ نعمت" لکھ کر طالبانِ علم کی پیاس بجھائی۔ انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور گزشتہ دہائی کے وسط میں "دی ایگنی آف پاکستان" لکھ کر بیرونی دُنیا کو تقسیمِ برصغیر پاک و ہند کے بارہ میں برطانیہ اور "انڈین نیشنل کانگرس" کی ملی بھگت اور سازشوں سے آگاہ کیا۔ یہاں پاکستان میں بھی اس موضوع کا مطالعہ کرنے والوں پر کئی نئے گوشے آشکار ہوئے۔

"تحدیثِ نعمت" کی طبعِ ثانی کے ناشران نے اپنی "معروضات" میں کہا ہے کہ "عرصۂ دراز سے اصرار ہو رہا تھا کہ اسے دوبارہ طبع کرایا جائے . . . . طبعِ اوّل میں محترم چودھری صاحب کے عالمی عدالت کے صدر منتخب ہونے تک کے حالات درج تھے۔ ہماری استدعا پر محترم چودھری صاحب نے اس کے بعد کے دس سالوں کے کچھ حالات مختصراً تحریر فرمائے ہیں۔"

"تحدیثِ نعمت" ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور معلومات کا بحرِ بیکراں۔ ساڑھے سات سَو صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں تقریباً اسّی برس کے وہ کوائف درج ہیں۔ جو اس برصغیر کی ثقافت و سیاست اور بالآخر تقسیمِ برصغیر اور قیامِ پاکستان کے بعد کے اہم ترین واقعات پر "فلڈ لائٹ" (FLOOD LIGHT) ڈالتے ہیں اسی لئے یہ کتاب اس ملک میں تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کے طالبعلم کے لئے لازمی (COMPULSORY) سمجھی چاہیئے۔ مقابلہ کے امتحانات میں بھی خواہ وہ فوج میں داخلہ کے لئے ہوں یا سول محکموں میں ہر سال ایسے سوال تحریری طور پر یا زبانی پوچھے جاتے ہیں۔ جن کا جواب اس کتاب میں موجود ہے۔

ویسے بھی ہر خواندہ پاکستانی کو یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ آزادی کی راہ کتنی کٹھن تھی —— اور قائدِ اعظم اور اُن کے رفقاءِ کار کو کیسے کیسے —— سنگ ہائے گراں راہ سے ہٹانا پڑے تھے۔

وسیع دستر خوان

سفرناموں کا شوق رکھنے والوں کے لئے بھی اس تصنیف میں ایک "وسیع دستر خوان" بچھا ہوا ہے۔ دُنیا کا کوئی ایسا چھوٹا بڑا ملک حتّٰی کہ کوئی ایسا آباد اور معروف جزیرہ نہیں جہاں وُہ نہ گئے ہوں۔ اور کوئی ایسی عالمی اہمیت کی شخصیت نہیں۔ جس سے وُہ نہ ملے ہوں ان تمام دَوروں اور ملاقاتوں کا ذکر انہوں نے نہایت دلچسپ پیرائے میں کیا ہے —— سربراہانِ مُلک و حکومت۔ بیرونی مدبّروں اور سیاستدانوں سے انہوں نے عالمِ اسلام خصوصاً ہند و پاکستان کے تنازعات پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ ان تمام مکالمات و مذاکرات کو انہوں نے ایک مورّخانہ انداز میں درج کیا



ہے۔ صدر کینیڈی سے جب اُن کی ملاقات ہوئی۔ تو وُہ اقوام متحدہ کے صدر تھے۔ لکھتے ہیں :۔

"صدر کینیڈی بڑے تپاک اور بے تکلفی سے پیش آئے۔ ملاقات کسی خاص موضوع پر نہیں تھی۔ مختلف امور پر گفتگو رہی۔ اُن دنوں ہندوستان اور چین کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اِس سلسلہ میں فرمایا ہم ایک لحاظ سے تو چین کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے مسٹر کرشنا مینن سے ہماری گلو خلاصی کرا دی۔"

صدر کینیڈی کے اس بے ساختہ اور کسی حد تک پُر مزاح فقرہ کے پیچھے ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کا ایک ایسا تلخ باب پنہاں ہے۔ جو آخر کار پنڈت نہرو کی موت پر منتج ہوا۔ کریملن میں مسٹر خروشیف سے ملاقات کا ذکر یوں فرماتے ہیں :۔

"مسٹر خروشیف مشرقی جرمنی کے مسئلہ کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ مَیں نے گزارش کی۔ کہ ایسے اہم مسائل کے حل میں جو بڑی طاقتوں میں موجبِ افتراق ہیں۔ پاکستان جیسے چھوٹے مُلک کی یہ حیثیت نہیں کہ وُہ مصالحت کرانے کے لئے کوئی اقدام کر سکے۔ البتہ اُس سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے۔ کہ کسی معقول تجویز کی تائید میں اپنی آواز بلند کرے"۔ خروشیف صاحب نے فرمایا: "پاکستان چھوٹا مُلک نہیں ہے۔ دس کروڑ انسان ہیں — پانچ کروڑ عمال ہیں۔ چھوٹا مُلک کیسے؟"

حواجی انقلاب سے قبل چین میں کیا ہو رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے — (واضح رہے۔ ۱۹۴۲ء میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں عارضی دارالحکومت "چُنگ کنگ" میں ہندوستان کے ایجنٹ جنرل تھے۔ ہندوستان کی حکومت چونکہ خود مختار نہیں تھی۔ اس لئے چین میں ہندوستان کا نمائندہ سفیر نہیں کہلا سکتا تھا) — شمالی چین کے بہت بڑے علاقہ پر جاپانی فوج قابض تھی۔ اور خود چُنگ کنگ پر جاپانی متواتر حملے کر رہے تھے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :۔

"تازہ دُودھ تو کہیں ملتا نہیں تھا۔ اس لئے دہی مکھن وغیرہ بالکل نایاب تھے .... ہر شے گراں تھی۔ اور دن بہ دن گراں ہوتی جا رہی تھی .... رشوت عام تھی۔ خود جنرل چیانگ کائی شیک کے ہم زُلف مسٹر "کُنگ" جو وزیر خزانہ تھے۔ عام شہرت تھی۔ کہ وُہ کھلے بندوں چور بازاری کے سلسلہ میں بڑے پیمانے پر سرداری کرتے ہیں۔ مُلک میں اس قدر مصیبت اور پریشانی کا زمانہ تھا۔ اور مسٹر کُنگ دونوں کلائیوں میں سونے کی گھڑیاں پہنے ہوئے تھے۔ واسکٹ کی ایک جیب سے دُوسری جیب تک سونے کی موٹی زنجیر لٹکتی تھی .... جب بولتے تھے یا ہنستے تھے۔ تو مُنہ کے اندر سونے کے دانت یا سونا جڑے ہوئے دانت نظر آتے تھے ..... برما روڈ کے رستے جو سامان اتنی مشکلوں سے مُلک کے اندر پہنچتا تھا اُس میں سے دو تہائی اُن کی ذاتی ملکیت بتایا جاتا تھا۔ جو اُن کی طرف سے چور بازار میں بکتا تھا۔"

"چُنگ کنگ" سے رخصت ہونے سے چند دن پہلے جنرل چیانگ کائی شیک اور میڈم چیانگ نے چودھری صاحب کو شام کے کھانے پر مدعو کیا — چودھری صاحب لکھتے ہیں :۔

"میڈم ویلزلی کالج (امریکہ) کی گریجویٹ تھیں۔ .... نہایت شُستہ طبع اور ذہین تھیں۔ کھانے پر بیٹھتے ہی فرمایا: "کھانا سب مُسلم مطعم سے آیا ہے خادم بھی وہیں کے ہیں۔ کسی غیر مُسلم کا ہاتھ کھانے کے قریب نہیں گیا۔ تم بلا تامل اطمینان سے کھاؤ —" کھانے کے دوران گرم تولیئے مرد مہمانوں کو ہاتھ اور چہرہ پونچھنے کے لئے مہیا کئے گئے۔ مَیں نے تجاہل کے انداز میں دریافت کیا۔ یہ امتیاز صرف مردوں کو کیوں بخشا گیا؟ مُسکرائیں اور کہا: "تم شریر معلوم ہوتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو۔ کہ اگر عورتیں چہرہ پونچھ لیں۔ تو اُن کے چہروں کی زینت بھی ساتھ ہی پُنچھ جائے گی۔"

کشمیر کی جنگ

اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کی طرف سے جنگ چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے لڑی۔ "تحدیثِ نعمت" میں چودھری صاحب نے اس مسئلہ پر ہندوستان اور برطانیہ کی لیڈر شپ کے چہرے سے منافقت کا نقاب جس طرح نوچا ہے۔ اُس کی تفصیل پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے — کتاب کا



امام جماعت احمدیہ صاحبزادہ حضرت مرزا طاہر احمد ایدہ اللہ اپنے حالیہ تبلیغی و تربیتی دورہ مغرب میں (اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں) ناروے کے دارالحکومت اوسلو کے میئر "ایلبرٹ نارڈینگن" (ALBERT NORDENGEN) کو تفسیر قرآن مجید (انگریزی) کے نسخہ سے نواز رہے ہیں۔



یہ حصّہ ہر پاکستانی طالب علم کے لئے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ایک مختصر مضمون میں یہ تفصیل نہیں سموئی جا سکتی۔ البتہ ایک دو واقعات کا نمونتہً ذکر کر دینا مناسب ہو گا۔

اقوام متحدہ کی کمیشن برائے ہند و پاکستان میں (جو کشمیر کمیشن کے نام سے مشہور ہوئی) پاکستان نے ارجن ٹائن کو اور ہندوستان نے چیکوسلاکیہ کو نامزد کیا تھا۔ چیکوسلاکیہ کی حکومت نے اپنے سفیر متعینہ (یوگوسلاویہ) ڈاکٹر جوزف کاربیل (KORBEL) کو نامزد کیا۔

ڈاکٹر کاربیل چودھری صاحب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"شروع شروع میں ہم سب کو (یعنی کمیشن کو) یہ احساس ضرور تھا۔ کہ مسٹر محمد علی اور تم دونوں پنڈت جواہر لال نہرو کی کسی بات کو محض اُن کے کہنے پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اور اُن کی ہر بات کا تحریر ... ہوا ... ضروری سمجھتے تھے۔ اس پر تمہارے ... ہمیں تعجب بھی ہوتا تھا۔ اور بعض دفعہ ہمیں دِقّت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا۔ کہ ایک بلند مرتبت شہرۂ آفاق ہستی جس کی عالمی شہرت ایسی نیک تھی۔ اُس کے زبانی قول یا وعدے کو قبول کرنے میں تم دونوں کو اس قدر تامل کیوں ہے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ جیسے جیسے ہمارا واسطہ پنڈت نہرو سے پڑتا رہا۔ ہمارے تجربے سے تمہارے مؤقف کی صحت کی تصدیق ہوتی رہی ....

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں۔ کہ جب میں کمیشن سے علیحدہ ہوا — اُس وقت تک ہم سب کی متفقہ رائے ہو چکی تھی کہ پنڈت نہرو کے متعلق تمہارے شکوک بالکل حق بجانب تھے۔"

سراوون ڈکسن

آسٹریلیا کی عدالت عالیہ کے جج سراوون ڈکسن کو سیکورٹی کونسل نے کشمیر کے قضیہ میں اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کیا۔ (سراوون ڈکسن بعد میں آسٹریلیا کے چیف جسٹس مقرر ہوئے) سیکورٹی کونسل نے انہیں ہدایت کی۔ کہ وہ رائے عامہ کے استصواب کی شرائط طے کرنے کے بعد استصواب کا انصرام کریں — چودھری صاحب لکھتے ہیں: سراوون

"— سراوون ڈکسن نہایت قابل اور پختہ کار شخص تھے۔ وہ کراچی تشریف لائے اور پھر ... گئے ... معلوم ہوتا ہے۔ وہ جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ ... کہ ہندوستان کے وزیر اعظم کوئی ایسی شرائط تسلیم کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ جن کے تحت آزاد اور بے لاگ استصواب رائے کیا جا سکے۔"

اسی سلسلہ میں سراوون ڈکسن نے ایک تجویز کا خاکہ پنڈت نہرو کے سامنے رکھا۔ اور اُن سے کہا کہ — "پیشتر اس کے کہ میں اس تجویز کی تفاصیل تیار کروں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ تفاصیل تیار ہو جانے پر اس تجویز کے متعلق میرے ساتھ — اور وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ تبادلۂ خیالات پر آمادہ ہوں گے یا نہیں — بقول سراوون پنڈت صاحب نے آمادگی ظاہر کی ....

نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب نے بھی سراوون ڈکسن کی تجویز پر تفاصیل تیار ہونے کے بعد تبادلۂ خیالات کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ سراوون نے فرمایا۔ یہ ابتدائی مرحلہ تو طے ہو گیا۔ اب میں اپنی تجاویز تیار کر کے فریقین کو تبادلۂ خیالات کی دعوت دوں گا۔ چودھری محمد علی صاحب نے سراوون سے کہا۔ کہ آپ پنڈت نہرو کو اطلاع کر دیں۔ کہ چونکہ دونوں فریق آپ کی تجویز کی تفاصیل تیار کرنے پر تبادلہ خیالات پر آمادہ ہیں۔ لہٰذا اب آپ تجویز کی تفاصیل طے کر کے انہیں مطلع کریں گے۔ سراوون کو ابھی پنڈت جی کے طریق کار کا تجربہ نہ تھا۔ اُنہوں نے فرمایا۔ "اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی" — چودھری صاحب پنڈت جی کو خوب جانتے تھے۔ اس لئے مُصر ہوئے۔ کہ انہیں بذریعہ تار ضرور مطلع کیا جائے۔ اُن کے اصرار پر سراوون تار بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ اور اُسی شام پنڈت جی کو تار دے دیا .... دُوسرے دن سراوون تشریف لائے۔ بڑے آزردہ تھے۔ فرمایا۔ "تمہیں معلوم ہے۔ پنڈت نہرو نے میرے تار کا کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے؟" دریافت کرنے پر فرمایا۔ پنڈت جی نے جواب دیا ہے :-

"مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لئے یہ بالکل نیا معاملہ ہے۔ تم دِلّی آؤ۔ تو اس پر بات چیت کریں گے۔"

سراوون ڈکسن دِلّی گئے اور تیسرے دن کراچی لوٹ آئے۔ کراچی پہنچ کر جو بات اُنہوں نے چودھری محمد ظفر اللہ خاں سے کہی۔ وہ سُنیئے :-

"— سراوون نے بتلایا۔ کہ دِلّی پہنچنے پر سر گرجا شنکر باجپائی اُن کی پیشوائی کے لئے مطار (ایئرپورٹ) پر آئے ہوئے تھے۔ جب ہم کار میں بیٹھ گئے۔ تو میں

غزل

سرِبزم آج رسوا کیا حسنِ پارسا نے — وہ سمٹ گئے حیا سے تو بکھر گئے فسانے
مرے راہبر نے جس سے مجھے دُور دُور رکھا — مجھے میری رہ بتائی اُسی ایک کج ادا نے
مرا دل رہے گا نازاں یارب مری خطا پر — کہ یہ لذّتِ حضوری مجھے دی مری خطا نے
ہوئے منزل آشنا وہ جنہیں تھا جنوں میسّر — کبھی رہ میں کھو گئے ہیں وہ جو تھے بڑے سیانے
یہ نیا نیا زمانہ، یہ نئی نئی سی قدریں — مجھے یاد آ رہے ہیں وہ جو لوگ تھے پرانے

دلِ بے شعور اُن کی تعبیر ڈھونڈتا ہے
کئی خواب ہم نے دیکھے کہ جو تھے بڑے سُہانے

عبدالمنّان ناہید (راولپنڈی)

نے اُن سے (سر گرجا شنکر سے) کہا۔ آپ کے وزیراعظم کا اپنی رائے بدل لینا تو مجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن اُنہوں نے یہ کیسے لکھا کہ انہیں میری کسی تجویز کا علم نہیں اور اُن کے لئے یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس کے جواب میں سر گرجا شنکر باجپائی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

SIR OWEN I CONCIEVE THE PRIME MINISTER MUST HAVE SUFFERED AN ATTACK OF TEMPORARY ANNESIA.

"مسٹر اوون۔ میرا خیال ہے کہ وزیراعظم پر شاید عارضی نسیان کا حملہ ہو گیا ہو"

چوہدری محمد ظفر اللہ خاں لکھتے ہیں۔

"سر گرجا شنکر کا یہ فقرہ دوہرانے کے بعد سر اوون نے جو کچھ کہا۔ وہ پنڈت جی کی وفات کے بعد ضبطِ تحریر میں لانا مناسب نہیں"۔

سر اوون ڈکسن نے اپنی ناکامی کی رپورٹ مجلسِ امن کو بھیج دی۔"

"تحدیثِ نعمت" اتنی معلومات افزا ہے کہ پڑھتے جائیے اور اس کی دلکشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ "دی ایجنسی آف پاکستان" اور "تحدیثِ نعمت" ہر لائبریری میں ہونی چاہیے۔ ساڑھے سات سَو صفحے کی اس مجلد کتاب کی قیمت صرف پچاس روپے ہے۔ طباعت عمدہ اور جلد نفیس و مضبوط ہے۔ کتاب "اشاریہ" (INDEX) کی سہولت کی حامل ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ اے رؤوف احمد ۴۸ جوہر محمود روڈ۔ نیو مسلم آباد لاہور (پاکستان) (ا۔ح)

اندازِ ادب

ہر کرن فاتحِ تاریکیٔ شب ہو جائے
نیک و بد کا یہی اندازِ ادب ہو جائے

ہے خزاں دیدہ چمن منتظرِ جنبشِ لب — آپ کی بات بہاروں کا سبب ہو جائے
ہم تو خاموش ہیں خاموش رہیں گے لیکن — نُطق بے تاب ہے اُس پر نہ غضب ہو جائے
پھُول بن کر جو مہکنے لگے داغوں کی بہار — رزم گہ میرے لئے بزمِ طرب ہو جائے
مُندمل ہو گا ہر اک زخم مگر کیا معلوم — کب تلک ہو نہ سکے اور یہ کب ہو جائے
خامشی کو مری محرُومیٔ دل تو نہ سمجھ — کَون جانے کہ یہی حُسنِ طلب ہو جائے
کیجئے شہر بہ شہر اپنا تبسّم تقسیم — اِس طرح سے بھی گُل افشانیٔ لب ہو جائے
کاروانِ شبِ تاریک کے سالار بتا — کیوں نہ ظلمت ہی ترا نام و نسب ہو جائے

ہم کو اِدراک جو ہو گُہر کے اُبھرنے کا نسیمؔ
مَرنے والوں کی اَدا جینے کا ڈھب ہو جائے

نسیم سیفی (ربوہ)

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد ایم-اے کے قلم سے

کیا روح سے رابطہ ممکن ہے؟

خواجہ حبیب اللہ صاحب فاروقی کے مندرجہ بالا عنوان کے تحت مضمون پر ملک کے اہل علم دوست حضرات سے التماس کیا گیا تھا۔ کہ وہ متلاشیانِ حق کی راہنمائی فرمائیں۔ سب سے آخر میں اور سب سے جامع مضمون ادارہ کو (اس سلسلہ میں) حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم-اے کا موصول ہوا۔ جس کی علمی و روحانی افادیت کے پیشِ نظر اسے شریکِ اشاعت خاص کیا جا رہا ہے ——— (ایڈیٹر)

مندرجہ بالا عنوان کے تحت مؤقر اخبار "لاہور" کی اشاعت مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۵۹ء میں ایک صاحب خواجہ حبیب اللہ فاروقی کا ایک دلچسپ مقالہ شائع ہوا ہے۔ ہر چند کہ یہ خاکسار آجکل بعض پریشانیوں کی وجہ سے وہ یکسوئی اور وہ فرصت نہیں رکھتا جو اس قسم کے موضوع پر قلم اُٹھانے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن فاروقی صاحب کا مقالہ حقیقۃً دلچسپ ہے۔ اور پھر محترم ایڈیٹر صاحب لاھور نے اپنے قارئین کو اس مضمون پر قلم اُٹھانے کی عام دعوت بھی دی ہے۔ اس لئے چند مختصر سے فقرات کے ذریعہ میں اپنے خیالات اور معلومات کا اظہار کرتا ہوں ——— وما توفیقی الا باللہ

دو حرفی جواب

سب سے پہلے تو میں مضمون نگار صاحب کے اِس سوال کا دو حرفی جواب دینا چاہتا ہوں۔ جو انہوں نے اپنے مضمون کے عنوان میں کیا ہے یعنی ——— "کیا روح سے رابطہ ممکن ہے"؟ ——— اس کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ ——— "ہاں ممکن ہے" ——— مگر میرے جواب کی تفصیل فاروقی صاحب کے مضمون کی تفصیل سے غالباً مختلف ہو گی۔ لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ روح کی پیدائش کے متعلق قرآنی تعلیم کی رُو سے روشنی ڈالی جائے کیونکہ اس کے بغیر میرے مضمون کا پس منظر واضح نہیں ہو سکے گا۔ قرآن مجید انسانی پیدائش کی تفصیل اور اُس کے مختلف مدارج بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:-

ولقد خلقنا الانسان من سُلٰلة من طین۔ ثُمّ جعلنٰه نطفة فی قرار مّکین۔ ثمّ خلقنا النطفة علقةً فخلقنا العلقة مُضغةً فخلقنا المضغة عظٰمًا فکسونا العظٰم لحمًا۔ ثمّ انشأنٰه خلقًا آخر۔ فتبٰرک اللّٰہ احسن الخالقین۔ (سورۃ مومنون۔ آیات ۱۳ تا ۱۵)

یعنی ——— ہم نے اِنسان کو ابتداءً مرطوب مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر اُسے ایک محفوظ قرار گاہ (یعنی رحمِ مادر) میں نطفہ کے طور پر رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو ڈھیلے ڈھالے چپکنے والے لوتھڑے کی صورت دی۔ پھر ڈھیلے ڈھالے لوتھڑے کو پیوست بوٹی کی شکل میں منتقل کیا۔ پھر اس بوٹی میں ہڈیاں بنائیں۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت پوست کا خول چڑھایا۔ اور پھر ایک نئی مخلوق کی صورت میں بنا کھڑا کیا۔ پس لوگو! دیکھو کہ خدا کیسا اور بہترین خالق ہے۔"



حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم-اے

جسم اور روح کی پیدائش کے مختلف مراحل

اِس لطیف آیت میں خداوندِ عالم نے انسان کے جسم اور اُس کی روح دونوں کی پیدائش کو نہایت لطیف رنگ میں اُس کے مختلف مدارج کی تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے ——— اوّلاً اس آیت میں جسم کی پیدائش کو مٹی کے خلاصہ سے لے کر نطفے اور پھر ڈھیلے ڈھالے لوتھڑے اور پھر پیوست بوٹی اور پھر ہڈی اور پھر گوشت پوست کے خول تک درجہ بدرجہ مکمل کرنا بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد روح کی پیدائش کا اسی جسم میں سے خلقاً آخر (یعنی ایک نئی پیدائش) کے الفاظ سے ذکر کرتے ہوئے اور اس کے ساتھ انشانٰه (یعنی بنا کھڑا کیا) کا لفظ لگا کر اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان میں یہ روح ہی ہے۔ جو اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرکے اور حیوانوں کے زمرہ میں سے نمایاں کرکے علیحدہ صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔

پس اسلام کی تعلیم کے مطابق

روح دراصل جسم ہی کا ایک ترقی یافتہ جوہر ہے۔

جو انسانی جسم کی تکمیل کے بعد اس کے اندر سے ایک نئی اور ارفع مخلوق کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ اور آریہ سماج کی طرح یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ روح ایک بیرونی چیز ہے جو باہر سے آکر انسانی جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ تو جب روح انسانی جسم ہی کا ایک ترقی یافتہ حصّہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا تعلق جسم کے ساتھ جو اُس کے لئے بطور بیج یا باپ کے ہے۔ کبھی بھی کامل طور پر منقطع نہیں ہو سکتا۔ اور کسی نہ کسی صورت میں ضرور قائم رہتا ہے۔ اس لئے حدیث میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ انسان کے مرنے اور اُس کی روح کے پرواز کر جانے اور اُس کے جسم کے بظاہر کلّی طور پر فنا ہو جانے کے بعد بھی اُس کے جسم کا ایک نظر نہ آنے والا حصّہ جسے گویا ایٹم یا مالی کیول کہہ سکتے ہیں (میں سائنس کا عالم نہیں ہوں۔ صرف سمجھانے کی غرض سے عام رنگ میں بیان کر رہا ہوں) ——— محفوظ رہتا ہے۔ اور اس حدیث میں اس حصّہ کو "عجب الذّنب" یعنی ریڑھ کی ہڈّی کے اسفل ترین حصّہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مرنے والوں کی قبروں کے ساتھ اُن کی روحوں کا کسی نہ کسی رنگ میں رابطہ تسلیم شدہ ہے۔ اور اکثر اولیاء و صلحاء کا تجربہ ہے۔ کہ جب وہ کسی فوت شدہ بزرگ شخص کی قبر پر جا کر توجہ سے دعا کرتے ہیں۔ تو بعض اوقات کشفی حالت میں صاحبِ قبر کی روح کے ساتھ اُن کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ

کشف اور خواب بالکل جداگانہ چیزیں ہیں۔ کیونکہ خواب نیند کی حالت میں آتی ہے ——— اور

کشف بیداری کی حالت میں ہوتا ہے

جبکہ کشف دیکھنے والے کی آنکھوں پر سے مادی پردے اُٹھا کر اُسے کوئی غیبی نظارہ دکھایا جاتا ہے۔ اور یہ نظارہ ایسا ہوتا ہے۔ جیسے مادی آنکھوں کے سامنے کوئی سینما کی تصویر پھر جاتی ہے۔

اسلامی اصطلاح کے مطابق قبر کی تشریح

اس جگہ یہ صراحت بھی ضروری ہے۔ کہ اسلامی محاورہ میں قبر سے ہمیشہ مٹی کے ڈھیر والی معروف قبر ہی مُراد نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے وُہ مقام بھی مُراد ہوتا ہے۔ کہ جہاں مرنے کے بعد حشر و نشر سے پہلے انسانی رُوح رکھی جاتی ہے ـــ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (سورۃ عبس آیت ۲۱)

یعنی ـــ خدا تعالیٰ ہر انسان پر موت وارد کرتا ہے۔ اور پھر اُسے اُس کی قبر میں رکھتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ دُنیا میں ہر انسان کو یہ مٹی کے ڈھیر والی قبر میسّر نہیں آتی۔ کیونکہ کروڑوں انسانوں کے مُردے جلائے جاتے ہیں۔ اور دفن نہیں ہوتے۔ لاکھوں انسان ڈوب کر مرتے ہیں۔ ہزاروں انسانوں کو جنگل کے درندے کھا کر ختم کر دیتے ہیں۔ تو پھر ہر انسان کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُسے خدا قبر میں رکھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ جیسا کہ حدیث میں صراحت آتی ہے۔

قبر سے مراد وُہ قیام گاہ لی جائے۔ جہاں مرنے کے بعد اور کامل حساب کتاب سے پہلے انسان کی رُوح رکھی جاتی ہے۔

چنانچہ انہی معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذاب النار سے ممتاز کرکے عذابِ قبر کی اصطلاح فرمائی ہے۔ جس سے ناواقف یا ظاہر پرست لوگوں نے یہ ظاہری قبر مراد لے کر قبروں کو فراخ بنانا شروع کر دیا تاکہ منکر نکیر نامی فرشتوں کے سامنے بیٹھنے کے لئے کافی جگہ میسّر آ سکے۔ حالانکہ یہاں یہ مٹی والی معروف قبر مُراد نہیں۔

بلکہ مرنے کے بعد مرنے والے کی رُوح کے رکھے جانے کا مقام مُراد ہے۔

یہ وہی مقام ہے۔ جسے دوسری اصطلاح میں قرآن مجید نے برزخ کا نام دیا ہے۔ جو حشر و نشر سے پہلے ایک درمیانی زمانہ کا مقام ہے۔ مرنے والی رُوحوں کا تعلق دُنیا کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں اُسی وقت تک قائم رہتا ہے۔ جب تک کہ وُہ قبر یعنی برزخ کے زمانہ میں رہتی ہیں۔ اس کے بعد یہ تعلق ختم ہو کر اُخروی زندگی شروع ہو جائے گی۔ میں شاید باریک مذہبی اصطلاحوں میں جا رہا ہوں۔ مگر دراصل یہ مسائل آپس میں اتنے مربوط ہیں۔ اور ان کی تاریں ایک دُوسرے کے ساتھ اس طرح الجھی ہوئی ہیں۔ کہ ان میں سے ایک کو دوسری سے جدا کرنا بظاہر ممکن نہیں۔

کیا مرنے والوں کی رُوح کے ساتھ ملاقات ہو سکتی ہے

اب رہا یہ سوال کہ کیا کبھی زندہ انسان کی کسی فوت شدہ انسان کی رُوح کے ساتھ اسی دُنیا میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ اور دراصل فاروقی صاحب کے سوالوں کا یہی مرکزی نقطہ ہے ـــ سو جیسا کہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے جواب میں میرا کہنا یہ ہے کہ

ہاں یہ ملاقات ہو سکتی ہے

لیکن میں اسے فاروقی صاحب کی طرح ایک تماشا نہیں سمجھتا کہ جب چاہا اور جس نے چاہا کسی فوت شدہ رُوح کو بُلا کر اس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ کیونکہ یہ نظریہ قرآنی آیات کے صریح خلاف ہے۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

(سورۃ مومنون آیت ۱۰۱)

یعنی مرنے والے اور اس دُنیا کے رہنے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ جو حشر نشر کے دن تک قائم رہے گا۔

یہ ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے؟

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس صورت میں فوت شدہ رُوحوں کے ساتھ زندہ لوگوں کی ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے؟ سو اس کے متعلق بھی قرآن مجید خاموش نہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

(سورۃ اسرائیل۔ آیت ۸۶)

یعنی ـــ اے رسُول! لوگ تجھ سے رُوحوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ (کہ اُن کا معاملہ کس طرح ہے) تو اُن سے کہہ دے کہ رُوح کا معاملہ خدا کے حکم پر موقوف ہے۔ مگر اے لوگو! تمہیں اس بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے یعنی تمہاری معلومات کا اکثر حصہ محض تخیل اور قیاس آرائی یا نظر کے دھوکے پر مبنی ہے۔ اور صحیح معلومات بہت کم ہیں۔

اِس کا ذریعہ صرف اذنِ الٰہی ہے

ملاقات تو یقیناً ممکن ہے۔ مگر یہ نہیں کہ جس نے چاہا۔ اور جب چاہا کسی مرنے والے کی رُوح کو بُلا کر اُس کے ساتھ بات چیت کر لی۔ یہ نظریہ قرآنی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ جو اس دُنیا اور دُوسری دُنیا کے درمیان ایک برزخ یعنی روک اور اوٹ کا قائل ہے۔ اور صراحت کے ساتھ فرماتا ہے۔ کہ رُوحوں کے ساتھ زندوں کا رابطہ صرف اذنِ الٰہی کے ساتھ ممکن ہے۔ اس کے بغیر ہرگز نہیں۔ دُنیا بھر کے اولیاء و انبیاء کی تاریخ ایسے واقعات سے معمور ہے۔ کہ دُعا اور توبہ کرنے پر اذنِ الٰہی سے اُن کی کسی مرنے والے کی رُوح کے ساتھ ملاقات ہو گئی ـــ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اُحد کے میدان میں رسُول پاک صلی اللہ علیہ وسلم




صاحبزادہ میرزا مظفر احمد ـــ (ایم۔ ایم۔ احمد) ـــ واشنگٹن۔ ڈی۔ سی میں جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما رہے ہیں

کے ایک صحابی عبداللہؓ شہید ہو گئے۔ تو ایک **کشفی انکشاف** کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے جواں سال مخلص بیٹے جابرؓ سے ازراہِ دلداری فرمایا۔ کہ جب تمہارے والد شہید ہو کر خدا کے سامنے پیش ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی قربانی سے خوش ہو کر فرمایا۔ کہ اگر کوئی خواہش ہو۔ تو بیان کرو۔ جابرؓ کے والد عبداللہؓ نے عرض کیا۔

خدایا تیری کسی نعمت کی کمی نہیں۔ مگر یہ تڑپ ضرور ہے کہ پھر زندہ کیا جاؤں۔ اور پھر تیرے رستے میں جان دوں۔

اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا — ہم تمہاری اِس خواہش کو بھی پورا کر دیتے۔ مگر ہم ایک ازلی ابدی عہد کر چکے ہیں — جو قرآن کے الفاظ میں یہ ہے۔

"انّھم لا یرجعون"

یعنی — مرنے والے اس دُنیا میں دوبارہ نہیں آ سکتے۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر میں قتل ہونے والے کفار کے لاشوں پر کھڑے ہوئے۔ تو آپ کو **عالمِ کشف** میں اُن کی رُوحیں دکھائی گئیں۔ جنہیں دیکھ کر آپؐ نے جوش کے ساتھ فرمایا:۔

ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ پُورا ہوتے دیکھ لیا۔ کیا تم نے بھی خدا کا وعدہ پورا ہوتے دیکھا۔

(بخاری کتاب المغازی)

اسی سلسلہ میں سلسلہ احمدیہ کے **بانی** ایک مشہور عربی قصیدہ میں فرماتے ہیں

واللہ انّی قد رایتُ جمالہٗ
بعیونِ جسمی قاعداً بمکانی
ورایتُ فی ریعانِ عمری وجھہٗ
ثمّ النّبی بیقظتی لاقانی

یعنی — خدا کی قسم میں نے **رسولِ پاک** صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کو اس جسم کی آنکھوں کے ساتھ اپنے مکان کے اندر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے بالکل آغازِ جوانی میں آپؐ کا رُوئے مبارک دیکھا۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عین بیداری کی حالت میں مجھے مکرّر ملاقات کا شرف بخشا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملاقات کے متعلق فرماتے ہیں۔

"میری بارہا کشفی حالت میں عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہے اور انہوں نے ایک ہی دستر خوان پر میرے ساتھ کھانا کھایا ہے"

(نورالحق حصّہ اوّل)

اسی قسم کے ہزاروں واقعات اسلام کی تاریخ بلکہ قبلِ اسلام کے رُوحانی لوگوں کے حالاتِ زندگی میں ملتے ہیں۔ مگر آج یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ سب **کشفی نظارے** ہیں جن میں خدا کے اِذن سے نہ کہ از خود مرنے والوں کی رُوحوں سے زندہ لوگوں کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور یہ خاکسار بھی اس معاملہ میں کسی حد تک صاحبِ تجربہ ہے۔ ولا فخر

رُوحوں کے بُلانے کی مزعومہ حقیقت

بالآخر یہ سوال رہ جاتا ہے۔ کہ آجکل جو بعض لوگ اور خصوصاً مغربی ممالک کے لوگ رُوحوں کے بلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُس کی حقیقت کیا ہے؟ سو چونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایسا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔ اس لئے میں اس قسم کے واقعات کے متعلق بصیرت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں اس قدر یقیناً جانتا ہوں کہ — بعض محققین نے اس قسم کے واقعات کو **نظر یا سماع** کا دھوکہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے کئی لوگ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی رپورٹوں کو حسنِ ظنی کی نظر سے دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

ایسے تجربات ہپناٹزم یعنی علمِ توجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جو ایک معروف اور مسلّم علم ہے اور قدیم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ جسے بعض لوگ غلطی سے **سحر** کا نام بھی دے دیتے ہیں۔ مگر اس علم کو رُوحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ وہ علم ہے جس میں ایک مشّاق **انسان** خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ اپنی توجہ کے زور سے بعض دوسرے لوگوں کے **دماغ یا حواس** پر ایک وقتی اثر پیدا کر دیتا ہے اور اس صورت میں ایک **معمول** کو بعض غیر حقیقی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں یا بعض غیر حقیقی آوازیں غیر حقیقی آواز میں حقیقت کے رنگ میں سنائی دے جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات اس کا اثر ایک سے زیادہ انسانوں تک بلکہ ایک انبوہ تک بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ اور ایک معتدبہ جماعت اس سے متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے۔

اس علم کو رُوحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔

بلکہ ایک غیر مسلم انسان حتیٰ کہ ایک دہریہ تک بھی مشق کے ذریعہ یہ ملکہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور خاکسار راقم الحروف نے ایسے کئی نظارے دیکھے ہیں۔ بلکہ اس علم میں کافی مشق کے ذریعہ بعض اوقات ایک غیر جاندار چیز پر بھی اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

بعض اوقات ایک جلتا ہوا لیمپ بجھایا یا مدھم کیا جا سکتا ہے۔ یا بعض اوقات ایک بند زنجیر کو کھولا جا سکتا ہے۔ یا ایک لکڑی یا لوہے کی چیز سے آواز اُٹھائی جا سکتی ہے۔ وغیرہ ذٰلک۔

اور یہ ایک ایسی معروف اور تجربہ شدہ بات ہے جس پر شاہد لانے کی ضرورت نہیں۔

اِنسانی رُوح اور حیوانی رُوح میں فرق

ضمناً یہ بات بھی بیان کر دینی مناسب نہ ہوگی۔ کہ انسانی رُوح اور حیوانی رُوح میں بھاری فرق ہوتا ہے۔ اور یہ فرق یہ ہے کہ

اِنسانی رُوح جسم سے الگ ہو کر بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مگر حیوانی رُوح کو یہ صلاحیت حاصل نہیں۔

بلکہ جب کوئی جانور مرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی اُس کی رُوح بھی مر جاتی ہے۔ اس لئے اکثر محققین حیوانی رُوح کو رُوح کا نام ہی نہیں دیتے۔ بلکہ اُسے **جان یا زندگی** کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور رُوح کا لفظ صرف انسانی رُوح کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس امتیاز کی وجہ یہ ہے۔ کہ جیسا کہ قرآن مجید نے بار بار صراحت کی ہے۔ **انسان ابدی زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔** جو اُسے کچھ اس دُنیا میں ملتی ہے۔ اور اس کا ایک بہت لمبا حصّہ مرنے کے بعد آخرت کی زندگی میں ملے گا۔ تاکہ وہ آخرت میں اپنے نیک و بد اعمال کی جزا یا سزا



۱۰ ستمبر ۸۲ء کو مسجد بشارت پیدرو آباد (اسپین) کی افتتاحی تقریب میں — منیر احمد جاوید — تلاوت کلام پاک کر رہے ہیں۔

پاک۔ مگر حیوانوں کی پیدائش میں یہ غرض مدِ نظر نہیں۔ بلکہ وہ صرف انسان کی خاطر اس ارضی زندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے انسان کے متعلق قرآن فرماتا ہے کہ

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددنٰہ اسفل سافلین۔ الا الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت فلہم اجرٌ غیر ممنون

یعنی ——— ہم نے انسان کو بہترین تقویم میں اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے اُسے اسفل ترین گڑھے میں گرا دیتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو سچا ایمان لاتے اور عمل صالح بجا لاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اجر ہمیشہ رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ بس اس مختصر نوٹ میں فادر ڈی ہاب کے سارے سوالوں کا اصولی جواب آ جاتا ہے۔ جس کے بعد اگر وہ پسند کریں۔ اور انہی لائنوں پر مزید غور کریں۔ اپنے معلومات میں کافی اضافہ کر سکتے ہیں۔

ولا علم لنا الا ما علمتنا اللہ العلیم۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

○

دو باتیں

"ہر بات میں بحث کرنا اچھا نہیں ——— بزرگوں کے سر غلطی تھوپنا بھی غلطی ہے ———"



غزل

منظر دھواں دھواں سا فضا شبنمی سی ہے
پھر بھی نہ جانے کیوں ہمیں اک تشنگی سی ہے

کس کا خیال رتجگے آنکھوں کو دے گیا
کس کو طلب ہے دل میں جو اک بے کلی سی ہے

بوندوں پہ ہے گماں کوئی پائل چھنک اٹھی
سوئی ہوئی فضا میں بھی اک نغمگی سی ہے

نشتر کی طرح دل میں اترتی ہے اس کی یاد
وہ چشمِ التفات جو اب اجنبی سی ہے

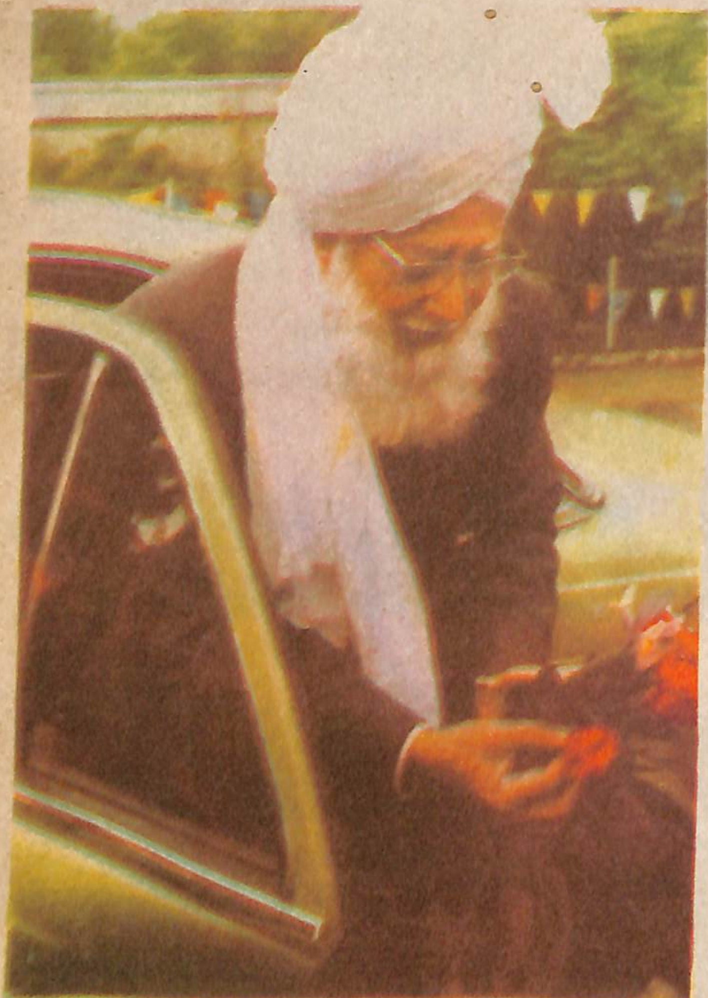
طوفان دے رہا ہے فضاؤں میں دستکیں
دریا کے ساحلوں پہ مگر خامشی سی ہے

چہروں پہ ہے چڑھی ہوئی گردِ منافقت
اب دوستی کا ذکر بھی دیوانگی سی ہے

تسخیرِ کائنات کے چرچے تو ہیں بہت
ہر شعبۂ حیات میں لیکن کمی سی ہے

کیا بات ہے کلیم بجھے پھر رہے ہو کیوں
اشکوں کا زہر پی کے بھی کیوں تشنگی سی ہے

کلیم عثمانی



ع ۔ جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

حضرت صاحبزادہ حافظ میرزا ناصر احمدؒ نوّر اللہ مرقدہٗ ۔ جنہوں نے ۹ ؍اکتوبر ۸۰ء کو مسجد بشارت (اسپین) کا سنگِ بنیاد رکھا

حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمدؒ ایدہ اللہ تعالیٰ ۱۰ ؍ستمبر ۱۹۸۲ء کو مسجد "بشارت" اسپین میں خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں۔









حضرت صاحبزادہ

میرزا طاہر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ

کا ممالک یورپ کے

حالیہ تبلیغی و تربیتی دَورہ

کے دَوران

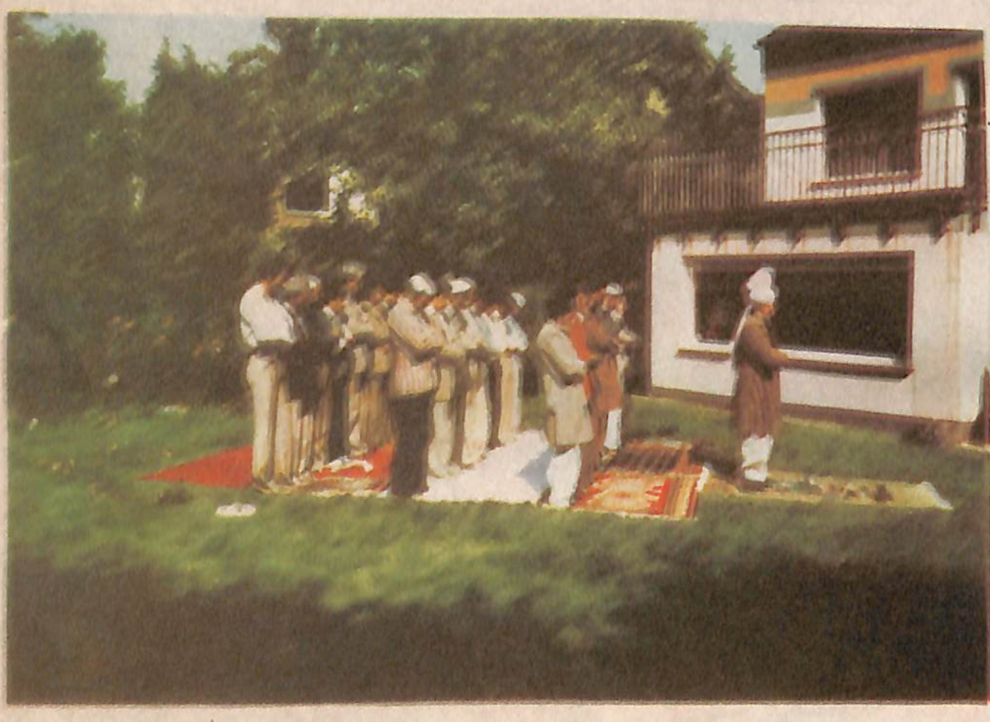
پریس کانفرنسوں

اَور اجتماعاتِ عام

سے خطاب



حضرت امام جماعت احمدیہ اور
آپ کے رفقائے سفر



مغربی جرمنی کے ایک شہر میں
نماز باجماعت

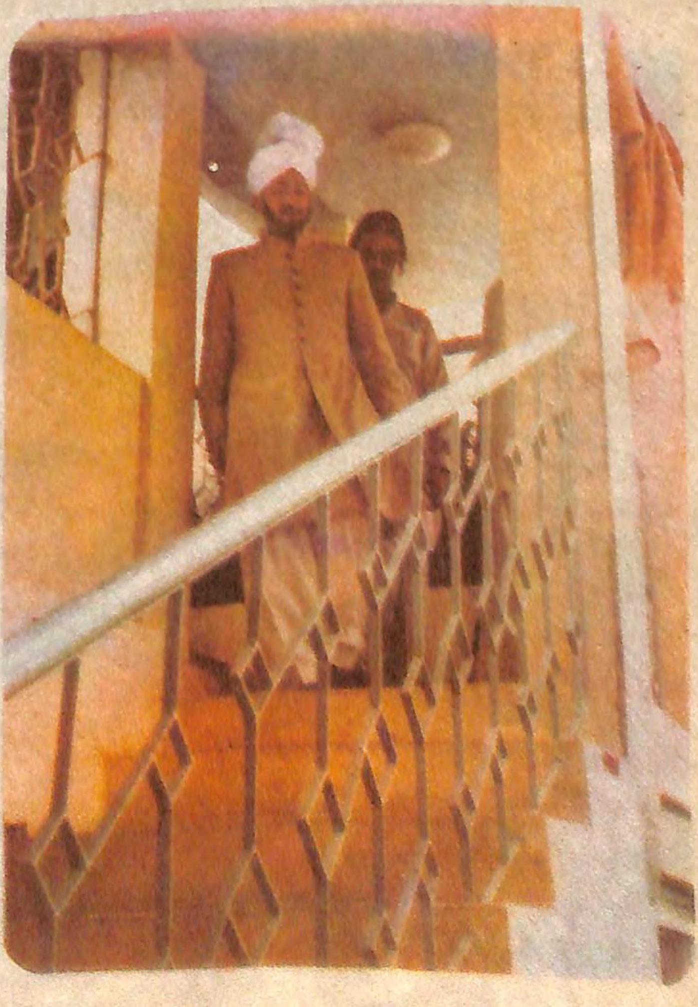


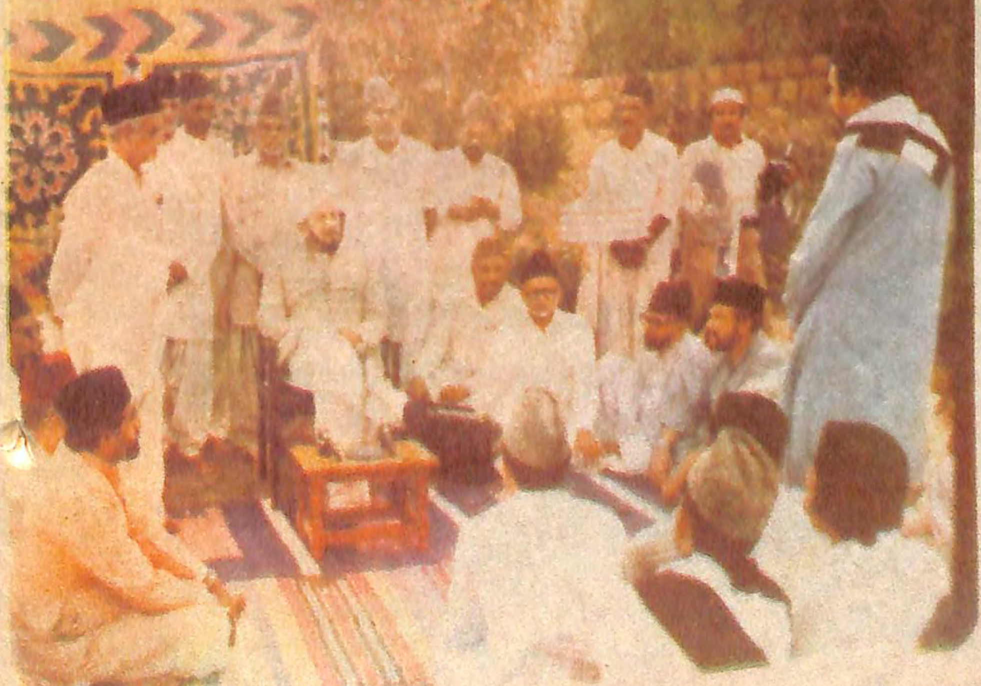
حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ
اور مدیر "لاہور"



جماعت احمدیہ کراچی
کے گیسٹ ہاؤس میں
حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمدؒ ایدہ اللہ تعالیٰ
بنصرہ العزیز
کی مجلسِ علم و عرفان
کے مناظر







راہ گیر

جہاں میں ہوں

ایک شکایت نامہ

ہمارے سیالکوٹ سے موصول ہونے والا ـــ ایک **شکایت نامہ** ـــ جس کا تعلق اُس **عبادت** سے ہے۔

- جو ان دِنوں صرف **لاوڈ اسپیکر** کے ساز ہی پر ادا ہوتی ہے۔
- جس کے لیے حاضرین و سامعین کی بجائے صرف ایک ـــ **ماحول پاش مائیکروفون** کی ضرورت ہے ـــ !
- کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے **لاوڈ اسپیکروں** کی **شکایت نگار** رقم طراز ہے :-

"ـــ میاں راہ گیر! یوں تو آپ کا گزر لاہور کی مال روڈ سے بلوچستان کے شاہی جرگوں تک ہے۔ اور آپ کی نگاہ ـــ "بس کنڈیکٹروں" سے لے کر "محصول چونگی" ـــ کے بابوؤں ہمہ کے کیسے کھنگال لیتی ہے۔ لیکن وائے قسمت کہ آپ کا گزر ہم برگشتہ نصیبوں کے قصبوں میں نہیں ہوتا۔ جن کی زندگیوں کا تمام سکون ان دنوں چند "مائیکروفونوں" کے رحم و کرم پر ہے۔ اور

جو اب **لاوڈ اسپیکروں** کے **صوتی ہتھوڑوں** سے پاش پاش کر دینے پر ادھار کھائے ہوئے ہیں۔

آپ نہیں آ سکتے۔ تو چلیے۔ آج میری زبانی ہی سے اپنی معلومات میں اضافہ فرمایئے ـــ ماشاءاللہ میرے قصبے کی مسجدوں کی نشانی ـــ ان دنوں میناروں کی بجائے **لاوڈ اسپیکر** ہیں۔ اور منبروں کی جگہ **مائیکروفونوں** نے لے لی ہے ـــ ہو سکتا ہے کہ بعض اور قصبوں میں بھی ـــ ہوں! ـــ مگر صرف اس نشاندہی کے لیے کہ فلاں قسم کی جو چار فٹ لمبی چوڑی اونچی اور چار فٹ چوڑی جگہ ہے، وہ ان میناروں والی چار دیواری سے آ رہی ہے۔

مائیکروفون کدہ

یہاں کوئی ہال نہیں۔ کوئی سرائے نہیں ـــ بس یہ ایک مینار والی چار دیواری ہی ہے۔ جو ان دنوں ان سب کی **قائم مقام** بنی ہوئی ہے۔ اِسے ہی کبھی واقعی "مسجد" کہا جاتا تھا مگر اب **"مائیکروفون کدہ"** کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ لہٰذا ہر مہمان اکثر اسی کے حجروں میں ٹھہرتا ہے۔ جسے دیگر فرائض کے علاوہ مائیکروفون کی چابی سنبھالنے کا کام بھی دکھانا پڑتا ہے۔ تاکہ

- جب وُہ تنہائی سے ڈرنے لگے ـــ!
- اُسے ڈراؤنے **خواب** تنگ کرنے لگیں
- یا ـــ تین چار گھنٹے پہلے دیکھی ہوئی فلم کا کوئی سین گدگدی کرے۔

تو وُہ بے دھڑک مائیکروفون کھولے۔ اُس پر چار پانچ دفعہ کھانسے بلکہ کھنکارے بھی۔ ایک آدھ دفعہ درود شریف پڑھنے کی بجائے اُسے الاپے۔ اور پھر جناب **ناصر** حضرت علیؑ ـــ یا "داستانِ **یوسف زلیخا**" ـــ ان میں سے جو کچھ بھی اور جتنا بھی یاد ہو۔

اُس کے بیت براڈ کاسٹ کرنا شروع کر دے
یا اگر اور کچھ بھی یاد نہیں تو بطرز **جگنی** کوئی پنجابی نعت ہی فضاؤں میں بکھیرنا شروع کر دے۔

آخر وُہ مہمان ہے۔ اُسے **نشریات کے مقامی پروگرام** کی پابندی سے کیا سروکار!

اسی طرح اگر کسی صاحب کو **وظیفہ** کا شوق چرائے تو اُسے اجازت ہے۔ کہ مسجد میں آئے۔ پہلے اُس کے کمی کرنے میں بیحد کرودُوح اور دل کی اُمنگ **کو پورا کرے**۔ اور جب تھک جائے۔ تو دُوسروں کو **جگانے یا تھکانے** کے لیے جس قسم کا کلام۔ نظم! عارفانہ اُسے یاد ہو۔ مائیک پر آ کر الاپنا شروع کر دے۔

پھر اسی طرح **مؤذن** کے بھی یہ بات فرائض میں شامل ہے۔ کہ وُہ اذان سے پیشتر تیس منٹ قبل ضرور آ کر **مائیک بازی** کی مشق کرے۔ نعت پڑھے، سلام پڑھے۔ یا ان دونوں کے علاوہ کچھ پڑھے ـــ بہر **حال کچھ پڑھے ضرور** ـــ تاکہ پیش امام کے پہنچنے تک **مائیکروفون کا گلا خوب صاف ہو جائے**۔

پھر اسی طرح کا ایک ہنگامہ خیز وقفہ **اذان اور نماز کے** درمیان آتا ہے ـــ پھر نماز اور اس کے بعد درس کے نام پر **یہی مشق لاوڈ اسپیکری**۔

حاضرین کی تعداد چھ۔ دیواروں کی تعداد چار۔ چھتوں کی تعداد ایک ـــ لیکن مولوی صاحب ہیں کہ **ہلکان** ہوئے جا رہے ہیں۔ مائیک سے بُری طرح **دُوبدُو** ہیں۔ اور اسی بیچارے پر یُوں سوار ہیں۔

غ ز ل

خلعتِ رنگ گلستاں کو عطا کون کرے
قرضِ مٹّی کا جو سر پہ ہے اُدا کون کرے

یک دو زخم اگر ہوں تو مُداوا ممکن
زخم بن جائے اگر جسم دَوا کون کرے

جہاں کانٹوں نے پہن رکھا ہو پھُولوں کا لباس
ایسے ماحول میں جینے کی خطا کون کرے

منجمد برف کی مانند ہیں دل سینوں میں
بند دروازوں پہ بے کار صدا کون کرے

زہرِ خاموشی پئے پھرتے ہیں سب اہلِ وفا
سب ہوں بے مہر جہاں ذکرِ وفا کون کرے

جھوٹ جس شہر میں پھیلا ہو وبا کی صُورت
حق وہاں حق و صداقت کا اُدا کون کرے

ایک چلتی ہوئی شمشیر ہے ہر تارِ نفس
قیدِ احساس سے اس دل کو رِہا کون کرے

دوش پر سب ہی ہواؤں کے اُڑے جاتے ہیں
آج اندازۂ رفتارِ ہوا کون کرے

سب اندھیروں کے پرستار جہاں ہوں ثاقب
چاک ظلمات کی شب رنگ رِدا کون کرے

ثاقب زیروی

جیسے اس کی رگیں نچوڑ نچوڑ کر
آواز بنا رہے ہوں۔
کیا ہُوا جو مسجدوں میں —
نمازی نہیں ہیں۔ **غازی تو**
ہیں۔ کردار کے نہ سہی **گفتار کے**
تو ہیں۔ اور گفتار بھی وہ جو ایک
گھمبیر نغمہ کی صورت میں مائیک
کے صدقے وارے ہوتی رہتی ہے۔
مگر یہ دور
مولانا آزاد مرحوم نے نہ جانے — کس
دقیانوسی دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا
"— میرے والد خطبہ دیا کرتے تھے
ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔ لیکن ہر
ایک کو آواز پہنچتی تھی"
لیکن اب تو وہ دور ہے کہ — حاضرین
ہوں یا نہ ہوں۔ آواز مائیک اور لاؤڈ اسپیکر میں سے
گزرے بغیر فضا سے متعارف ہونے کو تیار ہی
نہیں ہوتی — نہیں معلوم **"بی آواز"** کی اِس
"بال ہٹ" کا انجام کار نتیجہ کیا نکلے گا؟
میرے قصبے کی بدقسمتی کہ پچھلے دنوں یہاں
گیارھویں شریف آگئی۔ جس کا یہاں پورا
ہفتہ منایا گیا۔
ایک مسجد والوں نے آج "نیاز" دلائی۔
اور کھانے کے بعد مائیک پر حلال کی۔ تو دُوسرے
نے کل اور تیسرا ان دونوں دنوں میں پورے گلے
سے چیختا رہا۔ کہ
یہ سب کچھ غیر شرعی ہے۔
ناجائز ہے۔ بدعت قبیحہ ہے۔ اس
کا کوئی جواز نہیں — [illegible]
[illegible] کار [illegible] سکون جس نے
تلپٹ کر دیا۔
• اب ایک طرف سے [illegible]
• [illegible] ش رہی ہیں۔ اور
• اُدھر فلمی [illegible] کیا [illegible]
کے قصیدے [illegible]
پہلے [illegible]
بعد میں کچھ دکھا دیا"
تاکہ جس [illegible] دوڑ پہ خرچ
کرکے اس لذت [illegible] کہ وہ
اللہ کے گھر [illegible] دھما چوکڑی ہی
سے آشنا ہوئے۔
الغرض گیارھویں شریف
[illegible] برات معراج شریف

ہو ــ یا **میلاد شریف**
یا رمضان المبارک **کا آخری
عشرہ** ــ ان گلے بازنیم
تجت ملاؤں اور مرگیاں
بھرنے والے بھونڈے نعت
خوانوں کی آواز میں ــ **ان
مقدس ایام کے تقدس کو**
رُوئی کے گالوں کی طرح
دُھنک کر رکھ دیتی ہیں۔

مولانا و علامہ کی ممانعت

نہ جانے یہ کس منچلے کا مشورہ تھا۔ کہ
آئندہ کسی کو **مولانا یا علامہ** نہ لکھا جائے۔
حالانکہ میرے شہر میں دجے ہیں بے تکلف شہر
کہتا ہوں جبکہ وہ ہے صرف **تحصیل اسٹیشن**)

تو پوری والیوم سے روزانہ نشر ہوتا ہے ــــ
آج فلاں حضرت **مولانا** "قدوۃ السالکین۔ زبدۃ
العارفین۔ علامہ دوراں۔ روحی تم حافظ آبادی
وبعد ذالک ڈسکوی" فلاں مسجد میں فلاں نزاعی مسئلہ
پر تقریر فرمائیں گے ــــ اور ان کی تقریر کیا
ہوتی ہے۔

- پنجابی کے فقروں کو بھی بطرز **یوسف زلیخا** پڑھنا۔
- گلے کے زور پر پنجابی الفاظ کو بھی **عربی تلفظ** میں ادا کرنا۔
- جب تھک جانا تو **صلوات** کی طرح نعرہ رسالت لگوانا۔

ان خطیب دوراں کی سب سے بڑی خوبی
یہ ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان **نیک**
احساسات سے یکسر بے تعلق کر دیا ہوتا ہے کہ

- مسجد سے ملحقہ محلہ میں کوئی **ایسا بیمار** تو نہیں جسے ہیمرج ہو جانے کا خطرہ ہو۔
- کوئی طالب علم امتحان کی تیاری تو نہیں کر رہا۔ جس کے مطالعہ میں خلل واقع ہو رہا ہو۔
- ترسے کچھ ذی ہوش کسی ایسی تعمیری فکر میں تو مصروف نہیں کہ ــ اس ہڑبونگ سے ان کے فکر کی مرکزیت کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہو۔

لہٰذا "اللہ تیری یاری" کہہ کر اس طرح گلے
پھاڑتے ہیں ؎

جدا اسپیکر لاؤڈ، اوڈی گوہ چوڑی
اُتھے واہ او دلبرا واسطا ای

ہور گا او دلبرا واسطا ای
رَج کھا او دلبرا واسطا ای

گزارش کا جواب

اگلے دن جو کسی سادہ دل مسلمان کی شامت
آئی۔ تو اس نے مسجد میں یہ گزارش کی کہ
"ــ حضرت مولانا! میرے گھر
میں **اللہ کی رحمت** ہونے والی
ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی آواز زچہ کو
بہت زچ کر رہی ہے۔ لہٰذا
اگر یہ محفل کسی انسانی جان
کو بچانے کے لئے ختم نہیں
کی جا سکتی۔ تو کم از کم اس
بھونپو یعنی لاؤڈ اسپیکر کا دہانہ
ہی دوسری سمت پھیر دیا جائے"
تو مولانا نے وہیں سے اپنی گلے بازی کا
پینترا بدل کر اس غریب کے ایمان کر ــ
دھوبی پٹڑے مارنے شروع کر دیئے۔

- کون مردود ہے جو اللہ کے کلام سے پرہیز کرتا ہے۔
- قرآن مجید نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں۔ حالانکہ مسلمان عورتوں نے تو میدانِ جنگ میں بھی بچے جنے ہیں۔ (جیسے میدانِ جنگ بھی لاؤڈ اسپیکر کے محیط کا دوسرا نام ہو۔ اور ایسے بچے گویا آنکھیں کھولتے ہی جنگ میں کود پڑتے ہوں)

اور پھر انہوں نے اپنی مخصوص ملامانہ زبان
میں الاپنا شروع کیا۔

پرادے اَج رہ گئے نیں
ترے بے دین۔ ہائے اوہ ویلا
کتھے گیا۔ ہُن نا آگئی اے
چودھویں صدی جیں نوں دِین
دِیاں گلاں وں چِیڑیاں نیں۔
نعرۂ تکبیر!

یعنے صاحب، آگئی چودھویں صدی۔
(پندرھویں صدی (چودھویں صدی
شاید ان کے منہ سے محاورتاً ہی نکل گیا)

- مریض کے حقوق
- طالب علموں سے رواداری
- ہمسایوں کی دلداری
- عورتوں کی عزت

سب کچھ لاؤڈ اسپیکر پر کہا اور سنا جاتا ہے۔ جو آج بدقسمتی سے حضرت علامہ مرحوم جہاں رہتے تھے، شہر حافظ آباد کی رہ بد زبانی اور لاؤڈ سپیکر کی سے روبرو ہے۔ دیکھیں ان دونوں میں سے پہلے کون دم توڑتا ہے؟

آئے دن مطالبے

آئے دن مطالبات ہوتے رہتے ہیں ـــ سینما کے بورڈ اکھڑوا دیجئے۔ سینما کے عریاں پوسٹر دیواروں سے نوچ ڈالئے۔ مغربی ایکٹرسوں کے اشتعال انگیز پوز کر بدل ڈالئے۔ گانا سننا بند کر دیجئے کہ ـــ اس سے اسلام کا دل مجروح ہوتا ہے۔ بس صرف مولانا کا درس سنا کیجئے۔ مائیک اور لاؤڈ اسپیکر کے سازوں پر ـــ اپنی دو کانوں پر بیٹھے بٹھائیے۔ اپنے لحاف میں دبکے دبکائے۔ کہ ماشاء اللہ یہ سب کا نغم البدل ہے اور مزہ تو یہ ہے کہ بیک وقت تین[۳] اطراف سے قل دا ہو اللہ یہ تینوں درس باہم یوں متصادم ہوتے ہیں کہ

- کہیں ماں کے کانوں سے ذہنی گوناشتہ کرنے کی ہدایتیں دی جاتی ہیں کوئی حدیث سنائی گئی
- کہیں تانے والے کی ذہنوں سے سم ٹانگے کے پہیے آنے والے کو پیٹ چلتے جیسے ـــ مولوی صاحب کا کوئی برا یا کفر کا فتویٰ پڑ گیا ... اور
- کہیں کسی طالب علم کی زبانی پڑا سائنس کی کوئی تھیوری یاد کرتے کرتے مولوی صاحب کی زبان پر موسیٰ علیہ السلام کے دیدار یار کا یہ منظوم ترانہ رواں ہو گیا

پہلے کہا ـــ نہیں نہیں
بعد میں کچھ دکھا دیا

جناب راہ گیر صاحب! آپ کی تو سنا ہے بڑی بڑی اونچی مجالس تک رسائی ہے۔ آپ ہی یہ تو بتا دیں کہ

ہم غریبوں کی اس ہول سیل قسم
کے صوتی عذاب سے جان
کب چھوٹے گی؟

- ہلکے پیاروں کو ضرورت کے مطابق خاموش ماحول کب میسر آئے گا؟
- ہمارے بچے سکون کے ساتھ مطالعہ کب کر سکیں گے؟
- ہمارے یہاں کے مولوی صاحبان کو اللہ کا نام سکون، خاموشی اور سلیقہ سے لینا کب آئے گا!

جس حکومت نے بڑے بڑے شہرہ آفاق بلاؤں کی آوازیں ترتیب میں کر دی ہیں۔ جس حکومت نے سیاسی شعبدہ کاروں ـــ بلیک مارکیٹروں اور سمگلروں کی تقدیریں تک سربمہر کر دی ہیں۔ کیا وہ اللہ کے ان گھروں میں مائیکروفونوں اور لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ مچائے جانے والے اودھم پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتی؟ اللہ اُسے اس نیکی کی توفیق بھی دے ـــ آمین ثم آمین!

بھائی شکایت نگار! یہ بندۂ بے تقصیر مرسوم بہ راہ گیر اس دور میں کہ معاشرہ پر ہر طرف مولوی صاحبان ہی مسلط ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا ـــ کہ آپ کی اس صدائے دلگیر کو حیطۂ تحریر میں لا کر اُسے اپنے کالم "جہاں میں ہوں" کے طشت میں رکھ کر حکام بالا کے اونچے مسندوں کی بھینٹ چڑھا دے۔ اور "لاہور" کی ۱۹۸۲ء کی سالانہ **خصوصی اشاعت** اس کی گواہ ہے۔ کہ اس نے اپنا یہ فرض ادا کر دیا۔



ایک تقابلی جائزہ

تحریکِ آزادیِ ہند منزل بہ منزل

"تبصرہ" بر نہرو رپورٹ سے "خُطبہ" الٰہ آباد تک

از ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء

نکیم امانت علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقع پر بعض بڑی جامع اور مستند اور ضخیم کتب منظرِ عام پر آئیں۔ گزشتہ سال اور امسال بھی یومِ اقبال کی تقریبات پر تقاریر مضامین اور تصانیف کی کمی نہ تھی۔ اِن تمام مستقین و مقررین کی تان اس پر آکر ٹوٹتی ہے۔ کہ خُطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) ہی "تصورِ پاکستان" کی اوّلین خشت ہے۔ اور یہی وہ خطاب ہے جس میں حضرت علامہ نے ایک بالکلیہ آزاد اور کُلیتہً مقتدر مسلم مملکت کے قیام کی تجویز قوم کے سامنے رکھی۔ جو انڈین فیڈریشن سے بالکل آزاد علیحدہ اور خود مختار ہو۔ اس لئے خُطبۂ الٰہ آباد "اساسِ پاکستان" کہلانے کا بجا طور پر مشتمل ہے۔

جناب محمد احمد صاحب اپنی ایک ہزار صفحات کی ضخیم کتاب میں جو جشن صد سالہ کے موقع پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس بحث کو یوں سمیٹتے ہیں:۔

"— علامہ اقبالؒ نے اپنے خُطبہ الٰہ آباد میں مسلم مملکت کے قیام سے متعلق جو تصور پیش کیا تھا۔ اُس کی مختلف تعبیریں کی گئیں۔ کسی نے اس کو وفاقِ ہند کا جزو کہا — کسی نے اُس کو وفاقِ ہند کے اندر ایک خود مختار [illegible] قرار دیا — اور بعضوں نے اس کو تقسیم ہند کے مغائر ٹھہرایا۔ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت علامہ نے جو تجویز پیش کی تھی۔ اُس میں تقسیم ہند کا تصور مُضمر تھا۔ اور وہ تجویز دراصل ایک بالکلیہ آزاد اور کُلیتہً مقتدر مسلم مملکت کے قیام ہی کی تجویز ہے۔" (ص ۴۲۹)

علامہ بنام راغب احسن

لیکن حضرت علامہ خود اپنے مکتوب بنام راغب احسن (مورخہ ۶ مارچ ۱۹۳۴ء) میں رقم طراز ہیں:۔

"— جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انڈین وفاق کے اندر — ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جبکہ "پاکستان اسکیم" کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے۔ جو انڈین یونین سے باہر (علیحدہ) ہو —"

(روزنامہ "جنگ" ۲۱ اپریل۔ اقبال نمبر ۱۹۸۲ء)

گویا علامہ کو خود اصرار ہے۔ کہ نظریۂ پاکستان کا کریڈٹ (CREDIT) خُطبہ الٰہ آباد کے کھاتہ میں ہرگز نہ ڈالا جائے — میری تجویز کا اس سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں۔ اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی بھی ہے۔ تو وہ میری وضاحت کے بعد دُور ہو جانی چاہیئے — مگر ہمارے مصنفین ہیں۔ کہ علامہ کی ایک نہیں سُنتے۔ اور اُن کا کہنا ہے کہ حضرت آپ کو غلطی لگی ہے۔ آپ اپنے خُطبہ کو

— سمجھ ہی نہیں سکے۔ اور ہم تو تصورِ پاکستان کا سارا کریڈٹ (CREDIT) خطبہ الہ آباد کے کھاتے میں ڈال کر ہی دم لیں گے۔

یہ امر اطمینان بخش ہے۔ کہ کچھ عرصے گنتی کے چند لکھنے والے حقیقت پسندانہ طرزِ فکر اپنانے کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ مثلاً :-

قومی دستاویزات کے ڈپٹی ڈائریکٹر جناب اصفہانی کے حوالے سے رقم طراز ہیں :-

قائدِ اعظم کے معتمد ساتھی جناب اصفہانی مرحوم مختلف راہنماؤں کی ایک فہرست درج کر کے جنہوں نے اس قسم کے نظریات علامہ اقبال سے ماقبل پیش کیے تھے۔ تحریر فرماتے ہیں :

"— اس میں شک نہیں۔ کہ علامہ کی فکر۔ نظموں اور خطابات سے مسلم مملکت کے قیام کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر تاریخی حقائق کے خلاف ہے کہ مسلم مملکت کا تصور علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہے۔"

(جنگ لاہور۔ ۱۴ اگست ۸۲ء)

اسی طرح ممتاز صحافی ڈاکٹر عبد السلام خورشید اپنے مضمون شائع شدہ پاکستان ٹائمز میں لکھتے ہیں :-

"IN 1930 IQBAL STOOD FOR A "MUSLIM INDIA WITHIN INDIA WITH POSSIBLY A CONFIDERAL ARRANGEMENT WITH HINDU INDIA BECAUSE HE VISUALISED 'COMPOSITE ARMIES TO ENSURE THE DEFENCE ON THE NORTH WESTERN BORDER."

("IQBAL AND PAKISTAN." PAKISTAN TIMES. NOV: 9. 1982)

یعنی "— ۱۹۳۰ء میں اقبال کا مطالبہ ہندوستان کے اندر ایک "مسلم انڈیا" کا تھا۔ ہندو انڈیا کے ساتھ وفاقی انتظامات کے تحت۔ کیونکہ اُن کے ذہن میں شمال مغربی سرحد کے دفاع کے لئے ایک ملی جُلی افواج کا خاکہ تھا۔"

جناب ڈاکٹر عبد السلام صاحب خورشید کا اشارہ علامہ اقبال کے اس ارشاد کی طرف معلوم ہوتا ہے — علامہ نے خطبہ الہ آباد میں فرمایا تھا۔

" مجھے یقین ہے۔ کہ اگر یہاں ایک وفاقی مملکت قائم ہوتی تو مسلم وفاقی ریاستیں تحفظِ ہند کی خاطر ایک غیر جانبدار "ہندوستانی فوج" کے لئے ہر قسم کی امداد دینے کے لئے تیار ہوں گی .... بلکہ عہدِ اکبر میں تو ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت کا کام ایسے لشکروں کے سپرد تھا۔ جن کے جرنیل ہندو ہوتے تھے۔ اس لئے اگر وفاقِ ہند کی بنیاد پر کوئی غیر جانبدار فوج بنانے کا منصوبہ ہوا۔ تو یہ مسلمانوں کے جذبۂ وطن کو تقویت دے گا۔ اور آخر الامر اس شبہ کو بھی رفع کر دے گا۔ کہ اگر باہر کے مسلمان ملکوں نے حملہ کیا۔ تو ہندوستانی مسلمان اُن سے جا ملیں گے۔"

(خطبۂ الہ آباد۔ ماہِ نو تحریکِ پاکستان نمبر مارچ ۱۹۶۸ء ص ۱۱۲)

مختلف رنگوں میں

تاریخ جدوجہدِ آزادی کے ممتاز مورخین کے نزدیک، مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا نظریہ جن عوامی شخصیات نے مختلف رنگوں میں پیش کیا۔ ان میں سید جمال الدین افغانی۔ سر سید۔ الفریڈ سکارن بلنٹ۔ سر تھیوڈور مارسین۔ ولایت علی بمبوق۔ خیری برادران۔ عبد القادر بلگرامی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ خان سردار محمد گل خان۔ (آف ڈیرہ اسماعیل خان)، مولانا حسرت موہانی — اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو تاریخِ پاکستان کے ممتاز مورخ ہیں۔ اپنی کتاب "سٹرگل فار پاکستان" (مطبوعہ ۶۵ء) کے صفحہ ۱۱۹ پر رقم طراز ہیں :-

"— یہ دعویٰ کرنا۔ کہ علامہ اقبال خطبہ الہ آباد میں اس نظریہ کے اوّلین محرک تھے۔ درست نہیں۔ البتہ علامہ اقبال کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ وہ اہم اور مقبولِ عام شخصیت ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا نظریہ پہلی بار مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نہایت جامع رنگ میں دسمبر ۱۹۳۰ء میں پیش کیا۔ اور پھر اس نظریہ کا تفصیل سے جائزہ بھی لیا۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں "علیحدہ مملکت کے نظریہ" کی حیثیت علامہ اقبال کے اپنے مکتوب ۴ مارچ ۳۴ء کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے۔ کہ آپ کی مراد انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلم مملکت کی تشکیل تھی۔ آزاد علیحدہ مملکت مراد نہ تھی۔ رہا امرِ ثانی یعنی علامہ نے ۱۹۳۰ء میں جامع رنگ میں اور پھر تفصیل سے جائزہ لیا۔ تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ

— علامہ نے خطبہ الہ آباد میں ہندوستان کے اندر — ایک "اسلامی ہند" پر مفصل بحث کی ہے۔

- علامہ نے مسلمانوں کے لئے فیڈرل طرز (بجائے واحدانی طرزِ حکومت کے) کی خواہش کا اظہار فرمایا ہے۔
- علامہ نے صُوبہ سرحد اور صوبہ سندھ کو مناسب سیاسی مرتبہ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔
- علامہ نے مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کے لئے ۳۳ فیصد نمائندگی پر اصرار کیا ہے۔
- علامہ نے خطبہ الٰہ آباد میں جُداگانہ طریقِ انتخاب کی ترجمانی کی ہے۔
- علامہ نے صوبوں کی از سرِ نَو تقسیم کے تخیل کی ترجمانی کی ہے۔
- علامہ نے خطبہ میں نئے آیئن کے نفاذ سے پہلے مُسلم حقُوق کے تحفظ پر زور دیا ہے ——— نیز
- علامہ نے اسلامی روایات۔ اسلامی تمدن یعنی اسلامی کلچر کے تحفظ کے لئے ایک مخصُوص علاقے میں "مُسلم حکومت" کی ضرورت کا مطالبہ کیا ہے۔

(واضح رہے۔ ۱۹۳۷ء (جب انگریز اور ہندو بھی تقسیم ہند پر زور دے رہے تھے) کا دَور اس مضمون میں ہمارے پیش نظر نہیں ہم صرف ۳۰-۱۹۲۸ء کے حالات پر بات کر رہے ہیں)

یہ حقیقت آشکار ہُوئی

اس جامعیت اور اس تفصیل سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ کہ اقبال سے پہلے جن بزرگوں نے "مسلم مملکت" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اُن میں ایک تاثر یا ایک احساس مسلمانوں کی ہندوؤں سے "مغایرت" کا تو پایا جاتا ہے۔ "علیحدگی" کا ایک تصور اور جھلک تو ملتی ہے۔ لیکن ایک "مسلم مملکت" کسی مُبہم احساس یا سرسری تاثر کا نام تو نہیں ——— وُہ تو ایک قوم کے واضح۔ قطعی اور قابلِ عمل حل کے تمام پہلوؤں کی تصویر کشی کر کے اُن میں عمل کا رنگ بھرنے کا نام ہے۔ اور عملی رنگ بھرنے کا سہرا حضرت قائدِ اعظم کے سر ہے۔ مگر ——— اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی زندگی بحیثیت ایک تمدنی قوت کے ایک مخصُوص رقبہ میں مرتکز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور یہی "ارتکاز" اقبال کے تصورِ وطن کی رُوح ہے۔

اب دیکھنے والی بات صرف یہ رہ جاتی ہے، کہ کیا علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) سے قبل بھی کسی قائد اور راہنما اور دردمند لیڈر نے مسلم مطالبات پر اس سے بھی بڑھ کر مدلّل مفصّل اور جامع و مانع تبصرہ لکھا۔ اور پھر اسے ہندوستان کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے تک۔ اور پھر انگلستان کے مدبّروں۔ سیاستدانوں صحافیوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں تک پہنچا کر اُن کے دلوں میں مسلم مطالبات کی اہمیت اُجاگر کی۔ اور یوں مُسلم کلچر کی حفاظت کے لئے الگ نظامِ حکومت کی راہ ہموار کی؟

تقابلی تجزیہ

ہم اس سلسلہ میں حضرت امام جماعت احمدیہ صاحبزادہ میرزا بشیر الدین محمود احمد (اللہ اُن سے راضی ہو) کی کتاب ——— "مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ" مطبوعہ نومبر ۱۹۲۸ء (خطبہ الٰہ آباد سے دو سال قبل) کے چند اقتباسات بغیر تبصرہ اور ان اقتباسات کا خطبہ الٰہ آباد سے ایک تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت امام جماعت احمدیہ کی یہ کتاب (طبع ثانی) ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے نومبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ انگلستان کے مدبّرین اور پارلیمنٹ کے ممبروں تک پہنچایا گیا۔ بلکہ اس کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے بنگال اور گرد و نواح میں بھی کثرت سے تقسیم ہوا تھا۔ (واضح رہے۔ جو اقتباس اس کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان میں طبع ثانی کے صفحہ نمبر کا حوالہ دیا گیا ہے) اور خطبہ الٰہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء کے اقتباسات "ماہِ نَو" تحریک پاکستان نمبر شائع شدہ مارچ ۱۹۶۸ء کے حوالے سے (تقابلی جائزہ میں) درج کئے گئے ہیں۔

اختصار کی غرض سے حضرت امام جماعت احمدیہ کی جانب سے مسلم مطالبات کی ترجمانی کے لئے لفظ "تبصرہ" اور حکیم الامت علامہ

اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد میں مسلم مطالبات کی ترجمانی کے لئے لفظ "خُطبہ" استعمال کیا گیا ہے۔
اس بات کا اندازہ لگانا قارئین با تمکین پر رہا۔ کہ خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء تبصرہ بر نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء سے معنی و مفہوم کے اعتبار سے کس درجہ متاثر ہے۔

ہندوستان کے اندر "ایک اسلامی ہند" کا تصور

حضرت امام جماعت احمدیہ
تبصرہ بر نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

"اگر مسلمانوں کا مطالبہ پورا کیا جائے۔ تو ہندوستان کی حکومت کا طریق یہ ہوگا۔ کہ سب صوبہ جات اپنے اپنے علاقہ میں خود مختار حکومتیں سمجھے جائیں گے۔ جو اپنے قواعد اور ہندوستان کے مجموعی قواعد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس امر پر اتفاق کریں گے۔ کہ چند اقتدارات (جن کا ایک مرکز کے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ جیسے ملکی فوج (صوبہ جات اپنی ضروریات کے لئے ایک مقامی فوج بھی رکھتے ہیں) ریل۔ تار۔ ڈاک۔ محصول۔ بر آمد در آمد کا انتظام۔ امورِ خارجیہ۔ سکہ کا اجرا وغیرہ وغیرہ ایک مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں۔ جو اختیارات مرکزی حکومت کو شروع میں مل جائیں گے۔ اُن سے زائد اگر اس نے حاصل کرنے ہوں۔ یا کوئی نیا صیغہ نکلے جس کا اس سے پہلے خیال نہ ہو۔ تو وہ چند قواعد کے مطابق تمام صوبہ جات مل کر اور مشورہ کے بعد اگر چاہیں تو اُن کو عطا کریں گے۔ اس طرزِ حکومت میں ہر ایک صوبہ اپنے طور پر ترقی کرنے کا پورا اختیار رکھے گا۔ اسلامی صوبے بغیر "ہندو مرکزی حکومت" کی دخل اندازی کے خوف سے آزادی سے ترقی کر سکیں گے۔" (صفحہ ۶۲)

"فیڈرل گورنمنٹ کا اصول کوئی غیر مجرب اصول نہیں ہے۔ برٹش ایمپائر بھی درحقیقت ایک قسم کا فیڈریشن ہے۔ لیکن سب سے بہتر تجربہ ریاستہائے امریکہ میں ہوا ہے۔ ان ریاستوں کی گورنمنٹ کی ابتدا ہی فیڈرل اصول پر ہوتی ہے۔ اور برابر یہ گورنمنٹ ترقی ہی کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس وقت سب دنیا سے مالدار حکومت بھی ہے جبکہ سب سے طاقتور بھی۔" (صفحہ ۶۳)

"ان کے علاوہ ایک اَور

حکیم الامت علامہ اقبال
خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء)

"مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلمان ہندوستان" ہونا چاہیئے۔"

"میری رائے میں ایک خود مختار ہندوستان میں واحدانی طرزِ حکومت کی بات سوچنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ جنہیں "باقیماندہ اختیارات" کہا جاتا ہے وہ کامل خود اختیار ریاستوں کو مل جانے چاہئیں۔ اور مرکز کے پاس صرف وہی چند مخصوص اختیارات رہنے چاہئیں۔ جو تمام وفاقی نمائندوں نے آزاد رائے سے اُسے تفویض کر رکھے ہوں" (صفحہ ۱۰۸)

"ہندوؤں میں یہ خدشہ بھی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس نوع کی ریاستوں میں مذہبی قسم کی حکومتوں کی داغ بیل پڑ جائے گی۔" (صفحہ ۱۰۷)

"اسلام کو یہ موقع بھی میسر آجائے گا۔ کہ عربی شہنشاہیت نے اس پر جو چھاپ مجبوراً لگائی

حضرت امام جماعت احمدیہ
تبصرہ بر نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

نئی حکومت ہے۔ یعنی زیکوسلویکا۔ جس میں نئی قسم کا تجربہ کیا گیا ہے۔ یعنی سارے مُلک میں تو فیڈریشن نہیں۔ لیکن روتھینیا کے علاقہ کو ان لوگوں کے خوف کی وجہ سے کامل خود اختیاری حکومت دے دی گئی ہے۔ جس کو کبھی مٹا نہ سکنے کا عہد زیکوسلویکا نے کیا ہے۔ مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر اس طریق پر ہندو راضی ہو جائیں یعنی پانچوں مسلم صوبے۔ (علامہ کی اسکیم میں چار صوبے ہیں۔ ناقل) فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے متحدہ مرکزی حکومت کے تحت رہیں۔" (صفحہ ۶۴)

حکیم الامت علامہ اقبال
خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء)

تھی۔ اُس سے بھی دامن چھڑا لے۔" (صفحہ ۱۰۷)

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مجموعی ریاست بنا دیا جائے۔ خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر۔" (صفحہ ۱۰۶)

"اپنے مکتوب جناب راغب احسن مورخہ ۶ مارچ ۱۹۳۴ء میں اپنی اسکیم کی مزید تشریح علامہ نے ان الفاظ میں فرمائی ـــ "براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا مصنف (ایڈورڈ تھامسن) اس مغالطہ کا شکار ہے۔ کہ جیسے میری تجویز پاکستان کی اسکیم سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک میری اسکیم کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جبکہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا رنگ تشکیل دیا جائے۔ جو انڈین یونین سے باہر (علیحدہ) ہو۔"

(روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء)

مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ تھا۔ کہ حکومت کا طریق فیڈرل ہو یعنی تمام صوبوں کو اندرونی طور پر خود مختاری حاصل ہو۔

حضرت امام جماعت احمدیہ
تبصرہ بر نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نہرو رپورٹ کی بنا پر یہ امر ثابت ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ نمائندگی ملنا تو کجا جو نمائندگی اس وقت حاصل ہے وہ بھی اُنہیں آئندہ حاصل نہ ہو سکے گی۔ میں یہ بات ثابت کر چکا ہوں۔ کہ فیڈریشن کا سوال مسلمانوں کے لئے موت و حیات کا سوال ہے۔" (صفحہ ۷۵) ... مسلمان یاد رکھیں کہ اُن کے سب مطالبات میں سے وزنی مطالبہ یہی ہے۔

نہرو رپورٹ نے بجائے فیڈرل طریق حکومت کے ایک قسم کی یونیٹری (واحدانی) حکومت کی تجویز پیش کی ہے جو ملک کی اصل حاکم سمجھی جائے گی۔"

"ہمیں یہ شبہ ہے کہ (واحدانی نظام میں) مرکزی حکومت۔ مسلم اکثریت والے صوبوں کے کاموں میں صرف اِس وقت دخل نہ دے گی۔ جب ہندوؤں کے حقوق تلف ہو رہے ہوں۔ بلکہ بیجا دخل دے کر مسلمانوں کی ترقی کے راستہ کو روک دے گی ....

اس لئے ہندوستان کی وسعت اور اس کی زبانوں قوموں اور عادات کا اختلاف چاہتا ہے۔ کہ ہر

حکیم الامت علامہ اقبال
خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء)

"نہرو رپورٹ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرکزی مقننہ میں ہندوؤں کی اکثریت رہے گی۔ واحدانی نظام مملکت کی سفارش کر دی ہے۔ کیونکہ اس طرح پورے ہی ہندوستان پر ہندوؤں کو غلبہ و تسلط حاصل ہو جاتا ہے ... میری رائے میں ایک خود مختار ہندوستان میں واحدانی طرزِ حکومت کی بات سوچنے کے قابل بھی نہیں ہے .... میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کبھی یہ رائے نہیں دوں گا۔ کہ وہ کسی ایسے طرزِ حکومت پر راضی ہوں۔" (صفحہ ۱۰۸)

"پس یہ بات واضح ہے ـــ کہ سرزمینِ ہندوستان میں آب و ہوا ـــ نسل، زبان ـــ دین دھرم ـــ سماجی رسوم وغیرہ کے لاتعداد فرق ہیں۔ اس لئے ایک آئینی ڈھانچہ کی تخلیق کے لئے یہی راستہ مناسب ہے کہ زبان ـــ نسل ـــ تاریخ ـــ مذہب اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت سے ـــ

صوبہ الگ الگ آزادانہ ترقی کرے۔ ملکی حکومت کبھی بھی ہندوستان کے لئے مفید نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ فیڈرل اصول پر ہو۔" (صـ۱۲)

خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں ۔" (صـ۱۰۷)

حقوق کو بغیر حفاظت کے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم اپنے لئے اکثریت کے طالب نہیں۔ مگر کیا ہم اس قدر حق کے طلب کرنے میں بھی حق بجانب نہیں جو اس حق کی حفاظت کرتا ہو جس کے قائم رکھنے کے لئے ہی انتخابی اور نیابتی حکومت قائم کی جاتی ہے۔" (صـ۹۹)

کسی مرکزی مقننہ میں ان کے ۳۳ فی صدی مطالبۂ نیابت کو مجروح کرے۔" (صـ۱۱۲)

مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی طرح نیابتی حکومت دی جائے اور سندھ کو بھی الگ صوبہ بنا کر اسے نیابتی اختیارات تفویض کئے جائیں

حضرت امام جماعت احمدیہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ اب رہا سیاست کا سوال۔ سو سیاستاً ان صوبوں کے آزاد ہونے میں بڑا نفع ہے اور نہ ہونے میں نقصان۔ اگر سندھ کو نیابتی حکومت دے کر علیحدہ صوبہ نہ بنایا گیا۔ تو جیسا کہ خود نہرو رپورٹ نے تسلیم کیا ہے۔ سندھ میں سخت ایجی ٹیشن ہوگا۔" (صـ۶۷)

"۔۔۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان کو اگر نیابتی حکومت نہ دی گئی۔ تو ظاہر ہے۔ سرحدی صوبے ہونے کی وجہ سے وہ سرحد پار کی حکومتوں کی سازش کی آماجگاہ بن سکیں گے۔ بہترین سیاسی پالیسی یہی ہوتی ہے کہ سرحدی صوبوں کو خوش رکھا جائے۔ ورنہ ان میں ہمسایہ حکومتیں ریشہ دوانیاں شروع کر دیتی ہیں۔ اور خود ملک کا ایک حصہ اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہو کر اسے کمزور کر دیتا ہے۔ یہ ظاہر امر ہے۔ کہ اگر سرحدی صوبوں کو دوسرے صوبوں کے سے حقوق نہ ملے تو وہ ہندوستان سے ملحق رہنے پر رضامند نہ ہوں گے۔ اور ان کے دل میں خواہش پیدا ہوگی کہ وہ کسی دوسری مملکت سے مل کر اپنی آزادی حاصل کریں۔ پس صوبہ سرحدی اور بلوچستان کو آزادی نہ دینا بدترین سیاست ہوگی۔" (صـ۶۹)

علامہ اقبال ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ مسلمانانِ ہند کو کسی ایسی تجویز سے اتفاق نہ ہوگا۔ جس کے تحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے۔ اور سرحدی صوبے کا سیاسی مرتبہ وہی نہ ہو جائے۔ جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔" (صـ۱۱۳)

"۔۔۔ افغان بہادر ہیں۔ ذہین ہیں۔ اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے مصمم ارادے کے حامل بھی۔ وہ ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے۔ جو انہیں آزاد ملکی خود اختیاری کے حق سے محروم کرتی ہو اس قسم کے لوگوں کو ہر طرح سے مطمئن رکھنا انگلستان اور ہندوستان دونوں ہی کے مفاد میں ہے ۔ اس بدنصیب صوبے میں پچھلے دنوں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ فی الاصل نتیجہ ہیں اس سوتیلی ماں کے سے سلوک کا۔ جو اس کے ساتھ کیا گیا۔" (صـ۱۱۴)

۳۳ فی صد نمائندگی۔ ایک نہایت اہم مسئلہ

حضرت امام جماعت احمدیہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ نہرو رپورٹ کے مطابق) مسلمان نیابت اگر آبادی کے مطابق ہو۔ تو مسلمان ممبر ۲۵ فی صد ہوں گے اور ہندو ۷۵ فی صد۔ اور قانون اساسی ۶۶ فی صد ممبر بدل سکتے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہوئے۔ کہ قانون اساسی اس وقت بھی بدلا جا سکتا ہے۔ کہ جب ایک مسلمان بھی اس کی تائید میں نہ ہو۔ پس مسلمانوں کا حکومت میں دخل قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ۳۳ فیصد نہیں بلکہ ۳۴ فی صد ممبر ان دونوں مرکزی پارلیمنٹوں میں مسلمانوں کو دی جائیں ۔۔۔۔۔۔ ہم کس طرح اس طریق حکومت راضی ہو سکتے ہیں۔ کہ جو ایک چوتھائی آبادی کے

علامہ اقبال ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لئے علاقائی تقسیم کی تجویز کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو میں پورے زور کے ساتھ مسلمانوں کے ان مطالبات کو دہراؤں گا۔ جس پر "آل انڈیا مسلم لیگ" اور "آل انڈیا کانفرنس" نے بار بار زور دیا ہے۔ کہ مسلمانانِ ہند دستور کی کسی ایسی تبدیلی پر راضی نہ ہوں گے۔ جو ان کے اکثریتی حقوق پر اثر انداز ہوتی ہو ـــــ یعنی پنجاب اور بنگال میں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ جن کا تحفظ کیا جائے۔ یا پھر

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد قائم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک سب صوبوں میں اور کم سے کم پنجاب اور بنگال میں "جداگانہ طریقِ انتخاب" جاری رہے

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جداگانہ انتخاب اصولِ انتخاب کے بالکل خلاف نہیں ہے اور صرف یہ کہہ دینا کہ یورپ میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ طریق صحیح نہیں۔ کوئی دلیل نہیں۔ جس ملک میں ایسی اقوام بستی ہوں۔ کہ جو اپنی جداگانہ تہذیب اور جداگانہ مذہب رکھتی ہوں۔ اور ان کے درمیان ایک لمبے عرصے سے جھگڑے اور مناقشے ہوں۔ ان کے متعلق کوئی نہ کوئی احتیاط کرنی ضروری ہوگی۔ ورنہ چھوٹی قوم کی تباہی یقینی ہے۔" (صـ۱۰۴)

خطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ معاشرۂ ہندوستان کے مختلف افراد اس طرح علاقائی خانوں میں منقسم نہیں ہیں ـــ جس طرح یورپ کے ممالک ہیں۔ ہندوستان تو ایک بر اعظم ہے۔ جس میں مختلف گروہ انسانوں کے بسے ہوئے ہیں۔ اور ان کا تعلق مختلف نسل ہائے انسانی سے ہے۔ جدا جدا زبانیں بولتے ہیں۔ الگ الگ مذہب کے پیرو ہیں ۔۔۔۔۔ یہاں یورپ کے اصولِ جمہوریت کو ہندوستان میں کام میں لایا نہیں جا سکتا۔" (صـ۱۰۵)

صوبوں کی از سرِ نو تقسیم کے دو پہلو

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ نہرو رپورٹ کی رو سے ۔۔۔۔ کل کو مرکزی حکومت یہ فیصلہ کر دے۔ کہ آسام کو بنگال کے ساتھ بدل دیا جائے۔ تو اس کے راستے میں کوئی روک نہیں۔ یا انبالہ اور دہلی کے علاقے کو یو۔پی سے کاٹ کر پنجاب میں ملا دیں تو کیا مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں نہ بدل جائے گی؟" (صـ۵۹)

"۔۔۔ (اس خدشہ کی بنا یہ ۔۔) کہ نہرو رپورٹ میں یہ فقرہ موجود ہے۔ کہ صوبہ جات کی نئی تقسیم زبان اور کثرت آبادی کی خواہش کے مطابق (صـ۹۶) ہونی چاہیئے۔ نیز رپورٹ کے صـ۹۳ پر لکھا ہے۔

ہمارے شریک کار مسٹر سوباش چندر بوس تسلی ظاہر کرتے ہیں کہ اڑیا بولنے والے علاقے باہم ملا دینے چاہئیں۔ اور اگر مالی طور پر ممکن ہو۔ تو ان کا ایک جداگانہ صوبہ بنا دینا چاہیئے اسی طرح ان کی رائے یہ بھی ہے کہ آسام۔ اڑیسہ اور بہار کے بنگالی بولنے والے علاقوں کا مطالبہ کہ انہیں بنگال سے ملا دیا جائے۔ ایک معقول اور جائز مطالبہ ہے۔" (صـ۶۸)

خطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کی تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی رکھی گئی تھی۔ مگر اسے یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ تو بڑی لمبی چوڑی ریاست ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے ۔۔۔۔ لیکن اگر ضلع انبالہ اور شاید دوسرے ویسے اضلاع کو الگ کر دیا جائے جہاں غیر مسلموں کی آبادی غالب ہے تو پھر وسعت گھٹ جاتی ہے۔ اس طرح آبادی کا مسلم عنصر زیادہ رہتا ہے۔" (صـ۱۰۶)

دوسری کانفرنس کے موقع پر آپ نے "لندن ٹائمز" (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء) ایک بیان میں کہا:۔

"۔۔۔ میں ہندوستان کے ایسے صوبہ جات میں از سرِ نو تقسیم کا حامی ہوں جس میں کسی ایک فرقہ کی مؤثر نمائندگی ہو۔ جس کی وکالت نہرو رپورٹ اور سائمن کمیشن نے بھی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم صوبوں کے متعلق میری تجویز اسی تخیل کو آگے بڑھاتی ہے۔"

"LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL" BY B.A. DAR 1967-P.19

(بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۲۹۶)

مخصوص تمدن اور اپنی روایات کو قائم رکھ سکیں اور ان کی مذہبی رُوح تباہ نہ ہو جائے۔" (صـ۶۹)

مُلک میں شرح سُود پر کوئی حد نافذ نہ کی گئی۔" (صـ۱۰۷)

خُطبہ الٰہ آباد، دسمبر ۱۹۳۰ء سے چھ ماہ پیشتر حضرت امام جماعت احمدیہ نے ایک خُطبہ جمعہ میں اس امر کا واضح اشارہ فرمایا۔ کہ اگر برطانیہ نے مسلم حقوق کی نگرانی اور حفاظت نہ کی اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ان کی غلامی میں دے دیا۔ تو مُسلمان اپنے لئے علیحدہ اور خود مختار نظام قائم کر لیں گے۔ بعض محققین کے نزدیک خطبہ الٰہ آباد اسی تخیل کی ذرا زیادہ واضح صورت ہے۔

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ انگلستان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس وقت وہ ہندوستان کو آزادی دینے پر آمادہ ہو گا۔ اسی وقت سے مسلمان آزاد ہوں گے اور اُن کا حق ہو گا کہ وہ یہ مطالبہ کریں۔ کہ یا تو اُن کے حقوق کی نگرانی کی جائے یا وہ اپنی آزاد ہستی کے برقرار رکھنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ کہ ہر ایسے نئے نظام سے وابستہ ہونے سے انکار کر دیں۔ جو اُن کی آزادی کو کچل دینے والا ہو۔ اور اپنے لئے خود کوئی ایسا نظام قائم کریں جس کے ماتحت وہ اپنی آزادی اور حُریت قائم رکھ سکیں۔" (الفضل ۱۱ مئی ۱۹۳۰ء)

خُطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ بارے گول میز کانفرنس انگلستان کے مندوبین کی کامیابی کا واحد اندازہ اس بات سے لگایا جا سکے گا۔ کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین میں سے کتنوں کو قرار دادِ دہلی کے مطالبات پر متفق کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا۔ تو اس حالت میں وہ لمحہ آجائے گا۔ جب مسلمانانِ ہند ایک آزاد و متفق علیہ سیاسی عمل کے لئے تیار ہو جائیں گے۔" (صـ۱۱۵)

"میری قوم کو مستقبل قریب میں ایسے آزاد جادۂ عمل پر گامزن ہونے کی ضرورت لاحق ہو گی جس کے ذریعہ وہ موجودہ بحران سے نمٹ سکے۔" (صـ۱۱۶)

آئین کے نفاذ سے قبل مُسلم حقوق کا تحفظ

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ پس مسلمانوں کو آج ہی ہوشیار ہو جانا چاہیئے اور اپنے حقوق (آئین کے نفاذ سے قبل ۔ ناقل) محفوظ کر لینے چاہئیں۔ ورنہ جو کچھ وہ آج چھوڑیں گے۔ کل اُنہیں کسی صورت میں نہیں مل سکے گا۔ آج میں یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فارغ ہوتا ہوں کہ اپنے حقوق لینے کا یہی وقت ہے۔ اس وقت آپ نے غلطی کی۔ تو پھر آپ کا ٹھکانہ کہیں نہ ہو گا۔" (صـ۳۵)

خُطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ میں نے جو خطُوط تجویز کئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر وہ علاقوں کی از سرِ نو تقسیم بھی چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ تقسیم نئے آئین کے نفاذ سے قبل ہونی چاہیئے۔" (صـ۱۰۷)

حضرت امام جماعت احمدیہ نے دراصل نہرو رپورٹ کی اندرُونی شہادت کے ذریعہ سے ہی اس پر گرفت کی۔ کیونکہ نہرو رپورٹ نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا۔ کہ ہر قوم کی تہذیب جُداگانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے ـــ "حفاظت کا احساس پیدا کرنے کے ذرائع صرف یہی ہیں کہ حفاظتی تدابیر اور کفالتوں کے ساتھ "بہ حدِّ امکان" کسی قوم کو تہذیبی آزادی عطا کی جائے"۔۔۔ (نہرو رپورٹ صـ۲۸ ـــ ۱۹۲۸ء)
لیکن ہندو اس پہلو سے بھی مسلم حقوق کو پامال کرنے میں کوشاں تھے اور چاہتے تھے۔ کہ ہندو تہذیب پورے ہند پر غالب آجائے ـــ تبصرہ اور خطبہ الٰہ آباد میں اس پر رائے زنی ملاحظہ ہو۔

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان دو صوبوں میں جن میں اُن کی اکثریت ہے وہ اسلامی روایات کے مطابق اپنی مخصُوص تہذیب کو نشو و نما دیں۔" (صـ۸۲)

"۔۔۔ پس مسلمان چاہتے ہیں کہ ان دو صوبوں میں اس امر کا دروازہ کھلا رہے کہ وہ اپنی روایات کے مطابق نشو و نما پائیں۔ اور اس کی صورت سوائے ـــ محفوظ نشستوں کے اور کوئی نظر نہیں آتی۔" (صـ۸۷)

"۔۔۔ جس طرح ہندو صاحبان چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مخصُوص کلچر کو نشو و نما دیں اور دُنیا کے تمدن اور تہذیب میں زیادتی کا مُوجب ہوں۔ اسی طرح وہ سمجھ لیں۔ کہ مسلمانوں کا دِل بھی ہے۔ وہ بھی ایک شاندار روایت رکھتے ہیں۔ وہ بھی ایسے آباء کی اولاد ہیں۔ جن میں اقدام کا مادہ انتہا درجہ کو پہنچا ہوا تھا۔ اُن کی بھی اُمنگیں ہیں پس وہ بھی چاہتے ہیں کہ بعض صُوبوں میں جن میں وہ زیادہ ہیں، اُنہیں بھی اس امر کا مَوقع ملے کہ وہ اسلامی کلچر اور تہذیب کے مطابق نشو و نما پائیں"۔۔۔ (صـ۸۳)

"۔۔۔ یہاں دو مختلف قومیں اور زبردست قومیں آباد ہیں۔ جن کے مذہب الگ ہیں۔ جن کے تمدن کے اصُول الگ ہیں۔ پس ایک مستقل اکثریت کے مقابلہ میں ایک مستقل اقلیت بن کر رہنے کے لئے مسلمان کس طرح تیار ہو سکتے ہیں؟" (صـ۹۸)

"۔۔۔ اس کی ضرورت مسلمانوں کو یہ ہے کہ وہ اپنے

خُطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان ہی کی سرزمین میں اپنی ثقافت و روایات کے تحت آزادانہ نشو و نما کا اگر پُورا حق حاصل رہے گا۔ تو پھر وہ آزادیٔ ہند کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔" (صـ۱۰۵)

"۔۔۔ دُوسرے لوگوں کو بھی یہ حق و اختیار ہے۔ (یعنی ہندو صاحبان ـــ ناقل) کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر پھلتے پھُولتے رہیں۔" (صـ۱۰۵)

"۔۔۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ
- اسلام کی رُوح اس کی ثقافتی قوت کی شکل میں زندہ رہے۔ تو پھر اُسے ایک مخصوص علاقے میں مُرتکز کرنے کی ضرورت لابدی ہے۔
- اسلامی ریاست کا انحصار اخلاق کے تار و پُود پر اُستوار ہوتا ہے۔ جو انسان کو انسان بناتا ہے۔
- اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اس اداریے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو اُس نے ہندوستانی بنکاری کی تحقیقاتی کمیٹی پر کچھ عرصہ ہوا، لکھا تھا:
"قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ کام بھی تھا۔ کہ وہ سُود وصُول کرنے کی شرح طے کرے۔ مگر اسلام نے روپے پر سُود لینے کو تو قطعی حرام قرار دیا۔ مگر مسلمانوں کے زمانے میں کسی اسلامی

جمہور مسلمانوں کو ساتھ ملا کر چلنے کی زبردست تحریک

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ گاندھی نے اپنا رُخ عوام الناس کی طرف پھیر دیا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے۔ کہ حکومت جمہُوری کا مطالبہ کرنے والے جمہُور کو اپنے ساتھ ملائے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک طرف تو جمہُوری حکُومت کا مطالبہ کرے۔ اور دُوسری طرف جمہُور سے پیٹھ پھیرے رکھے۔ پس ضرُوری ہے کہ عامۃ المسلمین کو موجُودہ حالات سے آگاہ کیا جائے۔ اور اُن کی رائے کو مضبُوط کیا جائے۔ بڑے آدمیوں (یعنی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ ـــ ناقل) ـــ کی کانفرنس صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں بے شک مُمِد ہو سکے گی۔ لیکن وہ اس وقت تک کامیاب بنا دینے والے زور سے خالی رہے گی۔ جب تک جمہُور اُس کی پُشت پر نہ ہوں۔" (صـ۱۱۶)

خُطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ لیگ کو حتماً یہ بات طے کرنا ہو گی۔ کہ آیا وہ ایک ایسی جماعت رہنا ہے۔ جس میں صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے شامل ہوں۔ یا مسلمان جمہُور بھی اس میں شامل ہوں۔ جو اس وقت تک بوجُوہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے رہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ جو جماعت مسلمان جمہُور کے مفاد کو بہتر بنانے کی سعی و کوشش کے لئے اپنے آپ کو وقف نہ کرے۔ وہ کبھی بھی عام مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گی۔"

مکتُوباتِ اقبال بنام قائدِ اعظم جناح
مرقومہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

مُصیبت کے وقت "ہندوستانی مسلمانوں" اور "باہر کے مُلکوں کے مُسلمانوں" میں کوئی یگانگت ہو گی یا اس کے برعکس معاملہ ہو گا۔ اس نکتہ پر کچھ اختلاف موجُود ہے تبصرہ اور خُطبہ الٰہ آباد کے متعلقہ پیرے ملاحظہ ہوں۔

تبصرہ ۱۹۲۸ء

"۔۔۔ مسلمان اپنی مذہبی روایات کی بنا پر تمام دُنیا کے مُسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔

خُطبہ ۱۹۳۰ء

"۔۔۔ اگر وفاق ۔۔۔ بنیاد پر کوئی غیر جانبدار فوج بنانے کا مقصد ہُوا تو مسلمانوں

اور شدت سے اُن کے مصائب سے متاثر ہوتے ہیں۔ مسلمان اپنے اس وسیع جذبۂ محبت کو جو وُہ کُل دُنیا کے مسلمانوں سے رکھتا ہے۔ کس طرح دُور کر سکتا ہے۔ وُہ صدیوں سے اس کے ورثہ میں مل رہا ہے۔ اور در حقیقت وُہ اب اس کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے . . . . کل کو ہندوستان عرب پر اوم کا جھنڈا کھڑا کرنے کی نیت کرے۔ جیسا کہ آریہ لیڈر کہہ چکے ہیں۔ تو یقیناً مسلمان اس وقت اپنی اعلیٰ ذمّہ داریوں کو مُلکی ذمّہ داریوں پر قربان نہیں کر سکے گا۔" (صفحہ ۵۳)

کے جذبۂ وطن کو تقویت دے گا۔ اور آخر الامر اس شُبہ کو بھی رفع کر دے گا۔ کہ اگر باہر سے مُسلمان مُلکوں نے حملہ کیا۔ تو ہندوستانی مسلمان ان سے جا ملیں گے۔" (صفحہ ۱۱۲)

"اگر ہندوستان کی ہیئت سیاسیہ میں شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو پُورا پُورا موقعہ دیا گیا۔ تو وہ بیرُونی حملوں کے خلاف بھی ہندوستان کے بہترین رکھوالے اور محافظ ثابت ہوں گے۔ خواہ یہ یورش خیالات و عقائد کی ہو یا سنگینوں کی۔" (صفحہ ۱۰۶)

ترتیب، عبدالماجد شیخ (لاہور)

تین ۳ غزلیں

اک دو کا ذکر کیا ہے حادثے پیہم ہوئے
مدتیں گزری ہیں یارو آنکھ کو پرنم ہوئے

یاد کر لینا ہمیں بھی گر تمہیں منزل ملے!
قافلے والو، خدا حافظ کہ بے جاں ہم ہوئے

رائیگاں جائے گی تیری جستجو بادِ صبا
پھول مرجھائے ہوئے تو کتنے ہی موسم ہوئے

تک رہے تھے کیسی حسرت سے مرا ابرِ امکاں
دربدر کر کے مجھے خامہ بھی خود شبنم ہوئے

نقش جو ہم نے بنائے تھے رہے وہ جوں کے توں
ساحلوں کی ریت پر دریا کئی برہم ہوئے

کتنی دیواریں تھیں حائل درمیاں ان کے نصیر
ایک مدت سے جو بچھڑے آشنا ہم ہوئے

نصیر احمد (سرگودھا)

ہم پہ کیا چشمِ عنایت ہو گئی
زندگانی وقفِ حسرت ہو گئی

ایک دل اور اس میں لاکھوں حسرتیں
کس قدر وحدت میں کثرت ہو گئی

سنتے ہیں پیرِ مغاں سے شیخ کی
رات میخانے میں بیعت ہو گئی

کون لٹکایا گیا سولی پہ آج
کس کی یا در آج قیمت ہو گئی

وہ جب آئے حشر کے فتنے اٹھے
وہ گئے برپا قیامت ہو گئی

ہم ہوئے بدنام اس کا غم نہیں
ان کی تو خورشید شہرت ہو گئی

خورشید احمد (اوکاڑہ)

گر چراغِ آخرِ شب سے سفر ہوتا نہیں
کس لئے اعلانِ تقریبِ سحر ہوتا نہیں

دوستو! ہر موج ساحل سے گلے ملتی نہیں
دوستو! ہر سیپ کے اندر گہر ہوتا نہیں

میں گیا چشمِ تماشائی کی بینائی گئی
میری صورت تو کوئی محفل بدر ہوتا نہیں

شیخ کو درکار ہیں ادل کی ہمدردیاں
اس کے سجدوں میں خدا پیشِ نظر ہوتا نہیں

ہر ملاقاتی سے یوں رکھتے ہو امیدِ کرم
ہر ملاقاتی کے اندر چارہ گر ہوتا نہیں

ہر کرن لیتی نہیں قدسی اندھیروں سے خراج
ہر دیا بجھے چراغِ رہگزر ہوتا نہیں

عبدالکریم قدسی (لاہور)

ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

دل میں ترازو ہو جانے والے اشعار "سحرِ حلال" کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک جادو بھرا شعر لسان الغیب حافظ شیرازی کے کلام ہے ــــ شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے دل و دماغ پر کس قدر اثر انداز ہوا؟ ایک تاریخی واقعہ کی اہمیت رکھتا ہے جس کی تفصیل ذیل میں منقول ہے۔

اورنگ زیب نے جو بڑا متشرع بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ حکم دیا، کہ اتنی میعاد کے اندر اندر ــــ جتنی طوائفیں ہیں۔ سب نکاح کر لیں۔ ورنہ ــــ سب کو کشتیوں میں بھر کر دریا بُرد کر دیا جائے گا ــــ سینکڑوں نکاح ہو گئے۔ مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ چنانچہ اُن کو ڈبونے کے لئے کشتیاں تیار ہو گئیں۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا ایک حسین نوجوان طوائف روزمرہ آپ کے سلام کو آیا کرتی تھی۔ جب آپ وِرد و وظائف سے فارغ ہوتے تو وہ طوائف دست بستہ سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی۔ آپ نظر اُٹھاتے۔ وُہ آداب بجا لاتی اور چلی جاتی۔ آج جو وُہ آئی۔ تو بعد سلام عرض رساں ہوئی۔ کہ "خادمہ کا آخری سلام قبول ہو"

حقیقت حال دریافت کئے جانے پر طوائف نے تمام کیفیت بیان کر دی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیرازی کا یہ شعر

در کوئے نیکنامی۔ مارا گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا!

تم سب یاد کر لو۔ اور کل جب تم سب کو دریا کی طرف لے چلیں۔ تو بہ آوازِ بلند اس شعر کا وِرد کرنا۔ باقی ماندہ طوائفوں نے بھی اس شعر کو یاد کر لیا۔ جب بجانب دریا لے جائی جانے لگیں تو بیم و یاس کی ماریوں نے بڑے درد انگیز لہجہ میں یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ جس نے بھی سُنا۔ دل تھام کر رہ گیا۔ عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ کشاں کشاں اس کی بھنک عالمگیر کے کانوں میں بھی جا پڑی۔ تو وُہ بھی سُن کر بے قرار ہو گیا ــــ اور فرمان جاری کیا کہ

"سب کو چھوڑ دو"

وُہ دَور تو گزر گیا ــــ اب ایک نظر آج کے دَور پر بھی ڈال دیکھئے ــــ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

حافظ شیرازی کے وطن مالوف ہی میں حافظ کے اس شعر کا جادو مُطلق نہ چل سکا ــــ اور رہبرِ انقلابِ ایران علامہ خمینی کے ناقابل تغییر حُکم کی تعمیل میں ایرانی طوائفوں کو ــــ بلا استثناء نکاح کرتے ہی بنی۔ چنانچہ آج ایران میں زنانِ بازاری کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔

البتہ ــــ وطنِ مقدس پاکستان کے قلب لاہور شہر میں عالمگیری مسجد کے زیر سایہ اور مزارِ اقبال کے پہلو میں یہ انسانیت سوز دھندا جو امراضِ خبیثہ اور گوناگوں معاشرتی عیوب کا منبع ہے ہنوز جاری و ساری ہے ــــ ع

ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

کہ ہماری مقدس سرزمین (جہاں اسلامی نظام کی آمد آمد ہے) بدستور جسم فروشی کے کاروبار کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے!

سیّد دبیر حسین رضوی (علیگ)

اے نونہالانِ وطن

ترتیب: زاہد الحسن زاہد

مطالعہ

حضرت شہباز محمد بھاگلپوریؒ کی ایک دفعہ طلبِ علم کے سلسلہ میں کسی شہر میں مقیم تھے۔ جس درس گاہ میں وُہ پڑھتے تھے اس کا مالک بہت غریب تھا اور اس کی اتنی استطاعت نہ تھی۔ کہ طلبہ کے لئے رات کو روشنی کا انتظام کرے حضرت شہباز محمدؒ ایک بنیئے کی دکان پر تشریف لے گئے اور اس سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں رات کو آپ کی دکان کی روشنی میں اپنی کتابوں کا مطالعہ کر لیا کروں۔ اس طرح آپ کی دکان کی نگہبانی بھی ہو جائے گی — نیک دل بنیئے نے ان کو اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت شہباز محمدؒ ہر روز رات کو اس دکان پر چلے جاتے اور اطمینان سے اپنی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ شہر کے کسی بڑے دولت مند آدمی کے گھر شادی کی تقریب تھی۔ اس شادی کا شاندار جلوس اس بنیئے کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ چونکہ یہ دکان شہر کی بڑی سڑک پر واقع تھی، تماشا میں رنگ راگ کے شائقین چاروں طرف سے اس دکان کے سامنے جمع ہو گئے اور وہاں ساری رات شادی کا ہنگامہ برپا رہا۔ صبح کو بنیئے نے حضرتؒ سے پُوچھا کہ آپ نے کبھی اس سے پہلے بھی ایسی دھوم دھام کی شادی اور ایسا دل کش تماشا دیکھا تھا۔ آپ نے متعجب ہو کر فرمایا۔

"کیسی شادی اور کہاں کی دھوم دھام۔ مجھے تو کچھ خبر نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

بنیا یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی شخص مطالعہ میں ایسا غرق ہو کہ اُسے گرد و پیش کے ہنگامہ کی مطلق خبر ہی نہ ہو۔

(محمد عارف نجمی، شور کوٹ)

یہ سچ ہے

خلیفہ مامون الرشید بہت انصاف پسند تھا۔ اس کی نظر میں سب برابر تھے۔ ایک مرتبہ وہ مقدموں کے فیصلے کر رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت پھٹے پرانے کپڑے پہنے خلیفہ کی دہائی دیتی شور مچاتی عدالت میں آئی۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ افسروں نے اُسے ٹوکا۔ مگر وُہ بہت دُکھیاری معلوم ہوتی تھی۔ سیدھی مامون کے پاس جا پہنچی اور بولی: "اے امیر المومنین تیرے بیٹے عباس نے میری جائداد پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ مجھے میرا حق واپس کرنے سے انکار کرتا ہے۔"

بڑھیا کا مقدمہ شہزادے کے خلاف تھا۔ اس کی طلبی ہوئی اور اُسے صفائی پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ شہزادہ عباس عدالت میں بہت آہستہ آہستہ اور ادب کے ساتھ بول رہا تھا۔ لیکن جب وُہ بڑھیا بولتی تو خوب گلا پھاڑ کر اور چلا کر بات کرتی تھی اس پر ایک وزیر نے اُسے ٹوکا اور کہا۔ "اے بوڑھی عورت! تجھے معلوم نہیں قانون بہرا نہیں ہوتا۔ تو آہستہ کیوں نہیں بولتی؟ امیر المومنین کے ساتھ اس طرح اونچی آواز سے بولنا بے ادبی ہے۔"

خلیفہ نے یہ سن کر وزیر کو ٹوک دیا اور کہا۔ "یہ جس طرح کہتی ہے اسے کہنے دو یہ سچی ہے اور حق نے اس کی آواز بلند کر دی ہے اور عباس جھوٹا ہے اس لئے وُہ گونگا ہو گیا ہے۔"

آخر دونوں کا بیان سننے کے بعد مامون الرشید نے بڑھیا کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کی جائداد واپس دلا دی۔

(حمیرا وجاہت ڈار)

★

مرض کی دوا

ایک بادشاہ اپنے غیر معمولی موٹاپے کی وجہ سے تقریباً معذور ہو گیا تھا۔ اس نے مشہور طبیب ابوبکر رازی سے رجوع کیا۔

رازی نے اس کا معائنہ کیا، اور آزردہ لہجے میں بولے: "تمہاری عمر میں صرف ایک ماہ باقی رہ گیا ہے۔"

بادشاہ کو غصہ آگیا اس نے رازی کو قید میں ڈال دیا۔ مگر طبیب کی بات نے اسے سخت متفکر کر دیا تھا۔ وہ موت کی ایک ایک گھڑی گننے لگا۔ متفکر ہونا اس کے لئے بہت سود مند ہوا۔ اس کا جسم رفتہ رفتہ گھٹنے لگا۔ اور گوشت کم ہو گیا۔ اٹھائیس دن بعد اس نے رازی کو جیل سے طلب کیا اور غصے سے پوچھا:

"ہاں! اب کیا کہتے ہو؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولے: "میں غیب دان نہیں ہوں مجھے تو خود اپنی عمر کا حال معلوم نہیں بھلا تمہاری عمر کا کیا بتا سکتا ہوں؟ میرے پاس تمہارے مرض کی دوا اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ تمہیں غم اور فکر میں مبتلا کر دوں۔"

بادشاہ نے رازی کو انعام و اکرام سے نوازا۔

(محمد انور صابر، ساہیوال)

دلچسپ معلومات

چین میں تائی شان پہاڑ بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک پانچ ہزار فٹ بلند چوٹی پر پرانے زمانے کی ایک عبادت گاہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے چھ ہزار سیڑھیوں کا زینہ اب بھی موجود ہے۔ اونچائی کے لحاظ سے یہ اپنی قسم کا پہلا زینہ ہے جس کا ریکارڈ آج تک نہیں توڑا جا سکا۔

(تنویر القمر صابر، ساہیوال)

قہقہے

طارق: "ابو جی! مبارک ہو میری امتحان میں تیسری پوزیشن آئی ہے۔"

ابو جی: "شاباش بیٹے! تمہاری کلاس میں کل کتنے لڑکے تھے؟"

طارق: "ابو جی! صرف تین"

(نعیمہ نعمی بنت حنیف نعمی، ربوہ)

★

پہلا آدمی: "بس مونچھوں کا فرق ہے ورنہ آپ ہو بہو میری خالہ جان سے ملتے ہیں۔"

دوسرا آدمی: "لیکن میری تو مونچھیں نہیں ہیں۔"

پہلا آدمی (ہنستے ہوئے) "میری خالہ کی تو ہیں۔"

(ناہید کھوکھر۔ گوجرانوالہ)

خاوند: "بیگم! تم ملازمہ کو بے وجہ کیوں پھٹکار رہی ہو؟"

بیگم: "بس یونہی۔ دراصل جس روز میں اس سے قالین صاف کرواتی ہوں اسے اسی طرح ڈانٹتی پھٹکارتی ہوں۔ اور اس کے بعد وہ اپنا سارا غصہ قالینوں کو زور زور سے ڈنڈے مار مار کر اتارتی ہے۔"

(سہیل احمد ثاقب، بشیر آباد)

سلام (زاہد الحسن زاہد)

یا محمد مصطفیٰؐ ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام!

آپ جب تشریف لائے ہو گئے بت سرنگوں

آپؐ ہی کے لطف سے نازل ہوئی ہیں رحمتیں

آپؐ پہنچے عرش پر تو جھک گئے کون و مکان!

آپؐ ہی کے دم قدم سے رنگ و بو گلشن میں ہے

آپؐ ختم الانبیاء ہیں آپؐ "صادق اور امین"

بیکسوں اور بے سہاروں کا سہارا آپؐ ہیں

آپ کے در کی فقیری تختِ شاہی سے عظیم!

بھیجتے ہیں سب مسلماں آپؐ پر لاکھوں درود

آپؐ کا رتبہ ہے عالی بعد ربِ ذوالجلال

اے حبیبِ کبریا ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

مجتبیٰ نور الہدیٰ ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

بے نواؤں کی نوا ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

مرحبا صد مرحبا۔ ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

منبعِ لطف و عطا۔ ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

افتخار الانبیاء، ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

حامیٔ بے دست و پا، ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

اے شہِ ہر دو سرا۔ ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

پڑھتے ہیں صلِّ علیٰ، ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

مصطفیٰؐ شمس الضحیٰؐ ہر آن آپؐ پر لاکھوں سلام

آپؐ کے ہوتے ہوئے مایوسیوں سے خوف کیوں

شافعِ روزِ جزا ہوں آپؐ پر لاکھوں سلام

اسپین یا اُندلس۔ بقیہ ص۲

سنہ ۷۱۱ء کے وسط میں اسپین میں اسلامی حکومت کی بنیاد قائم ہو گئی ــ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سپین میں اسلامی حکومت کا بانی طارق موسیٰ بن نصیر کے عتاب کا شکار ہوا اور خود موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید کے جانشین خلیفہ سلیمان کے ہاتھوں سزا پائی اور زندگی کے باقی دن سخت مفلوک الحالی میں بسر کیے ــ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں سرزمینِ اندلس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ اور یہاں غرناطہ کے الحمراء اور قرطبہ کی فقید المثال مسجد ایسے پائدار نقش ثبت کیے۔ جن پر تاریخ آج بھی مفتخر ہے۔ اور جو اُن کے جاہ و جلال کے پائندہ و تابندہ ثبوت ہیں۔

رعایا خوشحال و فارغ البال ہو گئی۔ ملک میں جگہ جگہ سائنس اور دیگر علوم و فنون کی تدریس کی اَن گنت درسگاہیں قائم ہو گئیں۔ ابنِ رُشد کے فلسفہ نے متمدن دُنیا کو ایک نئی راہ دکھائی اور اُس کے فلسفہ کی ساری دُنیا میں دُھوم مچ گئی۔ قرطبہ نے ابوالوحید احمد بن زیدون ایسا نامور شاعر پیدا کیا۔ ابن حسن عباس کے تغزل نے شاعری کو فکر و وجدان کا ایک نیا حسن عطا کیا۔ ابوالقاسم فنِ جراحی کا موجد تسلیم کیا گیا۔ پھر اسی دَور میں اس سرزمین نے ادریسی ایسے درخشندہ ستارہ کو جنم دیا جس نے چاندی کی ایک گول تختی پر دُنیا کا نقشہ بنایا ــ اور امام اکبر ابنِ عربی اور مشہور مؤرخ ابنِ خلدون بھی اس علم پرور علم دوست اسی دَور میں پیدا ہوئے

لیکن افسوس کہ سات آٹھ صدیوں ہی کے بعد مسلمانوں کا عروج بھی رُو بہ انحطاط ہونا شروع ہو گیا۔ عیسائیوں کی بدخواہ و منتقم نگاہیں تو جاہ و جلال کی اس سلطنت پر پہلے ہی تھیں۔ پادریوں کی طرح جاہ پرست علماءِ سُو نے اپنی مشقِ تکفیر سے جلتی رُوحوں اور دِلوں سے سکونِ چھین کر اُن میں منافرت اور باہمی رنجشیں بھر دیں۔ یہاں تک کہ ان نام نہاد عالمانِ دین نے مسلمان حکمرانوں کو باہم گریبان گیر کر دیا۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنا کھونٹا مضبوط رکھنے کے لیے عیسائیوں سے استمداد کی بھیک مانگنے لگا۔ قبائلی عصبیت کے عفریت نے سر اُبھارا اور جہاں تہاں خانہ جنگی کے فتنے پھوٹ اُٹھے اور عیسائیوں کے پاؤں جمتے چلے گئے۔ مسلمان حکمرانوں کو ہر محاذ پر شکست ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سرزمینِ اُندلس سے ساری اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور سپین پر ایسے بدعہد اور کینہ پرور عیسائی حکمران کا تسلط ہو گیا جس کے نزدیک نہ زبان کا کوئی پاس تھا نہ عہد اور وعدہ کی کوئی توقیر ــ عیسائی حکمران نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی تمام مواعید کو بالائے طاق رکھ کر مفتوح مسلمانوں کو دی گئی تحفظِ جان و مال کی، تمام یقین دہانیوں پر خطِ تنسیخ کھینچتے ہوئے انہیں تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ وعدہ تو یہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت ہوگی اُن کے باہمی تنازعات کا فیصلہ حسبِ سابق اُن کے قاضی کیا کریں گے اور اگر وہ اسپین چھوڑ کر جانا چاہیں تو انہیں اپنی املاک کو فروخت کرنے کی اجازت ہوگی۔

لیکن اُس پر عمل یُوں کیا گیا۔ کہ مُلک بھر میں اُن کے قتلِ عام کا بازار گرم کر دیا گیا۔ جو جبراً عیسائی نہ بنائے جا سکے۔ انہیں مار مار کر سرحد پار دھکیل دیا گیا۔ اُن کی املاک بالجبر چھین لی گئیں۔ یہاں تک کہ سپین میں ایک بھی مسلمان (بحیثیت مسلمان) نہ رہا۔ علاوہ ان کے بہنیں بچے بوڑھوں اور بچاروں کے نذرِ آتش سونپ دیئے گئے۔

اسپین میں باہمی خانہ جنگیوں اور مذہبی مناقشوں کی بنا پر مسلمانوں کا زوال، ایک ایسا ناسُور ہے۔ جو خود تاریخِ اسپین کے لیے حیرت انگیز اور ملتِ اسلامیہ کے اس زخم سے آج بھی کرب و اندوہ کا خونابہ رِستا رہتا ہے اقبالؔ نے اسی انحطاط و زوال گزیدہ اسپین کو دیکھ کر کہا تھا ؎

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

صبح بشارت

الحمدللہ کہ صدیوں کے بعد صبحِ بشارت پھر طلوع ہوئی۔ اسلام کے سچے شیدائیوں کی ایک جماعت کو اللہ تعالیٰ نے ان پرانے خوابوں کو اپنے فضل سے زندہ تعبیروں میں ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور جس سرزمین سے اسلام کو "دیس نکالا" دے دیا گیا تھا۔ اسلام کے ان مبشروں نے اسی سرزمین میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے وارفتوں کی ایک نئی فصل اگادی اور پھر ۱۰ ستمبر ۱۹۸۲ء کو قرطبہ کے نواحی قصبہ پیدرو آباد میں ساڑھے سات سو سال کے بعد اسپین میں تعمیر ہونے والی مسجد بشارت کے بلند میناروں سے ابھرنے والی اذان کا سحر سارے اسپین میں پھیل گیا۔ اس اذان کو سننے والے کانوں سے سنتے ہوئے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اسپین کی بادِ سحر میں بسی ہوئی تمام خاموش اذانیں بھی اس اذان کے ساتھ ایکبارگی گونج اٹھی ہیں۔

اہلِ سپین اس دور میں بھی متعصب پادریوں کے ہاتھوں بہت آزردہ رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ اب وہاں "سوشلسٹ حکومت" کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ لیکن جو نظارہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ وہ گواہی ہے اس حقیقت کی۔ کہ اس سرزمین کو محبت و پیار سے آج بھی جیتا جا سکتا ہے۔ اور کہ ——— ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

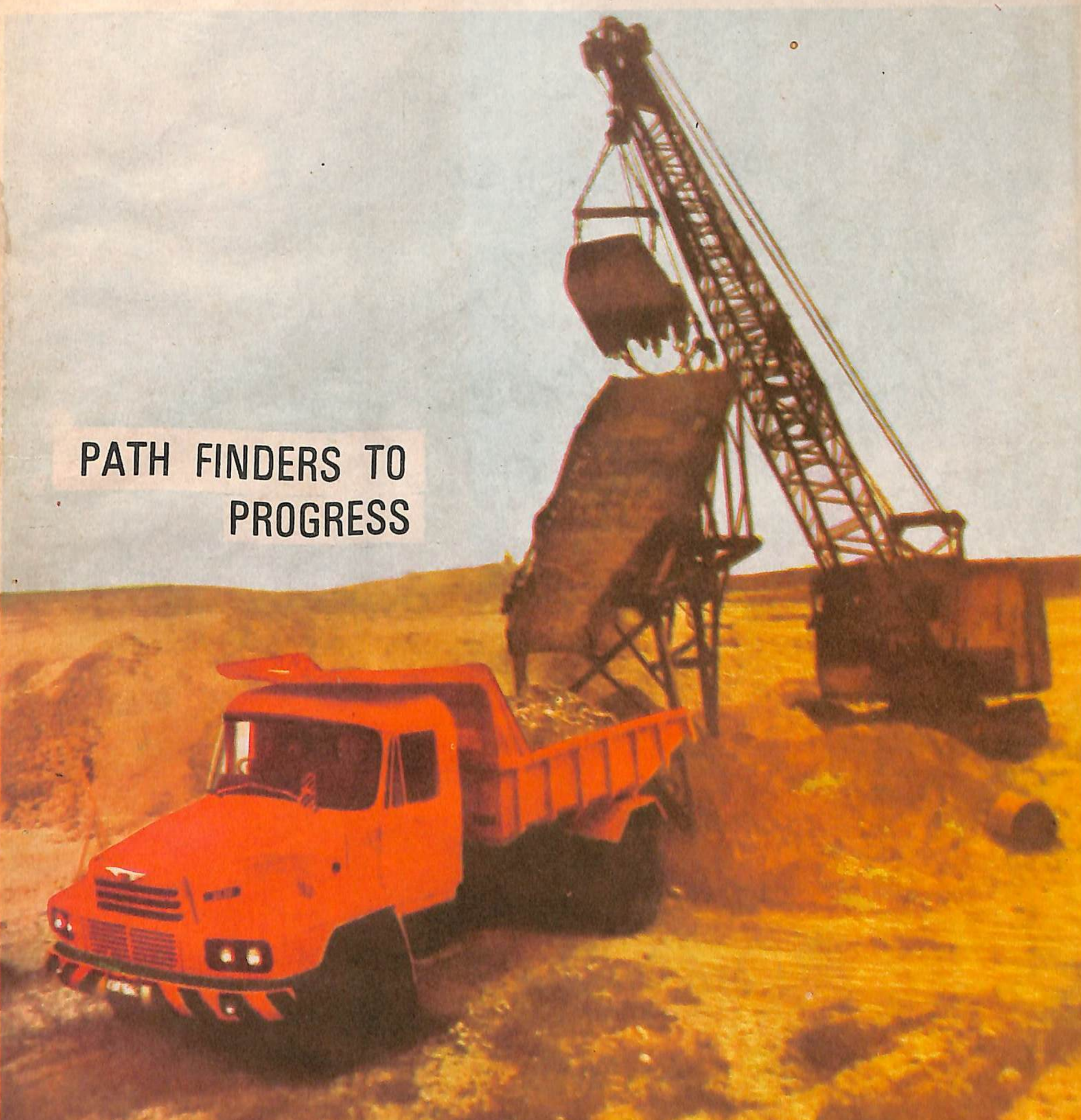
مگر محبت و پیار کی دولت (نفرت و تعصب کے ماتے) اسلام کے خود ساختہ اجارہ داروں کے پاس کہاں؟ اسپین میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ وہی جماعت کر سکتی ہے جو اس پیاسی زمین میں نورِ اسلام کی تخم ریزی کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دے۔ جس کا مقصد صرف اور صرف لوائے اسلام کو بلند کرنا اور بلند رکھنا ہو نہ کہ عارضی اور ناپائدار حکومت کے لئے نمائشی طور پر اسلام کی رٹ لگانا!

ESTABLISHED IN FEB. 1952

THE LAHORE

REGISTERED No. L. 5791

Editor :—SAQIB ZEERVI



RAFI SONS LIMITED

CIVIL ENGINEERS — CONTRACTORS FOR HIGHWAYS & AIRFIELDS
FORTRESS STADIUM LAHORE CANTT.
TELEPHONE : 37 24 93

LEADING ILLUSTRATED URDU CULTURAL AND LITERARY WEEKLY OF PAKISTAN
THE BEST MEDIUM FOR ADVERTISEMENT TO BRING PROMPT AND LASTING RESULTS